موم کے سائبان

شہناز مزمّل



موم کے سائبان

شہناز مزمّل

طبع اول۔ جولائی ۱۹۹۴ء

ش ہ ن ۔ م شہناز مزمل
موم کے سائبان ر شہناز مزمل

SHA --- M.Shahnaz Muzammil

Mom Kay Saiban (Shelter of Wox)

انتساب

طویل مسافتوں کے نام

BIO-DATA

تعلیمی قابلیت:	ایم اے لائبریری سائنس، پنجاب یونیورسٹی	1984ء
	فرانسیسی زبان (شارٹ کورس)	1989ء
	کمپیوٹر (شارٹ کورس)	1990ء
	انتظامی امور (شارٹ کورس)	1990ء
	ڈی ایچ ایم ایس، پنجاب	1991ء
	سائنٹیفک مینجمنٹ، ہالینڈ (شارٹ کورس)	1992ء
	بانی چیف لائبریرین گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن لائبریری لاہور	
	اجراء ادبی سرگرمیاں برائے فروغ مطالعہ	
	تصنیف و تالیف ۔ لیکچرز	
	ملتان ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہونے والی پہلی نسوانی آواز	
ممبر شپ:	پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن	
	انجمن طلباء قدیم	
	انٹرنیشنل ویمن ایسوسی ایشن	
	قادری ویلفیئر سنٹر: ڈائریکٹر	
	حلقہ تجدید سخن ماڈل ٹاؤن، صدر	
	ادب سرائے ماڈل ٹاؤن لاہور: چیئرپرسن	
	الکبریٰ ویلفیئر ایسوسی ایشن، لاہور برانچ انچارج	
ایوارڈز:	ایوارڈ برائے حسن کارکردگی	10 جون 1989ء
	ایوارڈ برائے حسن کارکردگی	10 جون 91-1990ء
	ادبی ایوارڈ گورنر پنجاب	13 ستمبر 1991ء
	جنگ ٹیلنٹ ایواڈ	11 نومبر 1993ء

ترتیب

نظمیں

غزلیں

دوسرا طبقہ یا گروہ ان شاعروں، ادیبوں اور قلمکاروں کا ہوتا ہے۔ جو سانس تو اپنے زمانے ہی میں لیتے ہیں لیکن ان کی شعری بصارت، ادبی بصیرت اور فکر ارتقاء کے حصار سے ماضی کے اقدار بھی کبھی اوجھل نہیں ہونے پاتیں وہ ماضی کی روایت کو عصری تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرکے ایسا فن پارہ تخلیق کرتے ہیں جو اپنے عہد کا نمائندہ ادب کہلاتا ہے، وہ ماضی کی صحت مند، وقیع اور زندہ رہنے والی اقدار و روایات کو اپنے بعد کی نسلوں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور یہ کسی روایتی شاعر کے بس کا روگ نہیں

شہناز مزمل صاحبہ دوسرے طبقہ کی نمائندہ شاعرہ ہیں، بلاشبہ ماضی کی اقدار و روایات کی تام جھام کے ساتھ نئی شعری تخلیقات کا عصر رواں سے منظم ربط ان کا خاصا ہے۔ شعری سفر کی لسانی تاریخ میں وہ اپنا ایک منفرد مقام بنا چکی ہیں۔ نظم ہو یا غزل اتنی سجی ہوئی ہوتی ہے کہ معنی کے مفہوم کی ترسیل بلکہ ابلاغ واضح انداز میں قاری تک پہنچتا ہے۔ لفظوں کی نشست و برخاست، روانی وتسلسل، موسیقیت و ترنم، اس کے اضافی جزو ہیں اور یہی جزیات جب کل کی شکل اختیار کرتے ہیں تو شہناز صاحبہ کے فن کی آبیاری ہوتی ہے شہناز مزمل صاحبہ کسی گروہ بندی یا ازم کا شکار نہیں ہوئیں ان کی شاعری پر کسی قسم کا لیبل نہیں لگایا جاسکتا۔ وہ تو صرف اور صرف انسانیت کی شاعرہ ہیں اور یہی ان کی شاعری کا حسن ہے۔

کرامت بخاری

شہناز مزمل ۔ ایک منفرد کائناتی شاعرہ

ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، زہرہ نگاہ، پروین شاکر، پروین فناسید، شبنم شکیل، فاطمہ حسن جیسے ناموں کے بعد نوشی گیلانی، درانجم عارف، یاسمین حمید اور شہناز مزمل کے نام ادب کے منظرنامے پر روشن ہوئے ہیں۔ شہناز مزمل کا راستہ ان تمام سے مختلف ہے۔ اس سے مراد کسی بھی شاعرہ کو رد کرنا ہرگز نہیں۔ ہر کسی کا اپنا اپنا

مضبوط حوالہ ہے۔

شہناز مزمل اپنے ہونے کو محسوس کرنے اور اپنے گمشدہ تشخص کو ڈھونڈنے میں صبح و مسا سرگرداں ہے ۔ وہ اپنے آپ کو کائنات سے جوڑنے کی سعی کر رہی ہے۔ اسے انسانی بے بسی اور بے چارگی پر غصہ بھی آتا ہے ' وہ دریدہ دامن ' سربریدہ خواہشات 'کرب کے رتجگوں اور نیم جاں سرگوشیوں سے آگے نکل کر حرف نامعلوم کے علاقے میں جانے کے لئے بے تاب ہے 'مگر اسے احساس ہے ۔

کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا
کسی برگد کا دکھ
اور ڈار سے بچھڑی ہوئی اک کونج کی لمبی اڑانوں کو
کہ سب کے سب تو خود کھوئے ہوئے ہیں
اور اپنی چمکتی تیز آنکھوں کو مچانوں پر سجایا ہے
تو یوں تاریکیاں اندر ہی اندر بڑھتی جاتی ہیں
سلاسل یاس کے پھیلے ہوئے ہیں
سمندر دور ' دریا دور' بادل دور ہیں جاناں
کڑی ہے دھوپ منزل بے نشان ہے
کسی دیوار کا سایا
کوئی بارانِ رحمت کی روا سر پر نہیں ہے
کہ جتنے سائباں ہیں سب کے سب ہیں موم کے جاناں

شہناز کے ہاں جاناں' بہت معنویت کا حامل ہے' یہ ایک زندہ کردار کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ہے ' جیسے کوئی رازداں سہیلی ہو ۔ یہ جاناں فراز کے جاناں سے بہت مختلف ہے ۔ یہ شہناز کا اپنا ہی پرتو ہے جس کے ساتھ وہ دکھ سکھ سانجھا کرتی ہے '

مدتوں اپنے حلقہ اثر میں رکھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

روحی کنجاہی

شہناز مزمل کو میں نے مختلف مشاعروں میں سنا۔ یہ اندازہ تھا کہ وہ بھی ہمارے ان اگنت شعراء شاعرات میں سے ہیں جو وقت گزاری کے لئے شاعری کرتے ہیں لیکن جب ان کا شعری مجموعہ میری نظر سے گزرا تو میں نے دو آراء قائم کیں ایک یہ کہ کسی شاعر کی دو چار "مشاعرتی" غزلیں سن کر اس کی شاعری کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہئے اور دوسرے رائے شہناز مزمل کے حوالے سے تھی جو میری پہلی رائے سے بالکل مختلف تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ شہناز کی شاعری وقت گزاری کے خیال سے کی گئی شاعری نہیں ہے ۔ بلکہ ان کے پیچھے انسان کا وہ صدیوں پرانا دکھ ہے جو اپنی تمام سہولتوں اور راحتوں کے حصول کے بعد بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ یہ احساس ذات اور شکست ذات کی کہانی ہے جو گھوم پھر کر ایک ہی موڑ پر آن کھڑی ہوتی ہے ۔ ہجر اور جدائی کے لمحے مختلف زمانوں میں مختلف انسانوں سے مختلف باتیں کرتے ہیں کبھی یہ مایوسی اور ڈپریشن کے اتھاہ اندھیروں میں گرا دیتے ہیں اور کبھی جدائی کے دکھ کو دوسرے انسانوں کے لئے وصال کی خوشیوں میں بدل دیتے ہیں ۔ ان کی ذات کا خلوص ہجر اور جدائی کے لمحوں میں وہ رنگ بھر دیتا ہے جو قوس قزح کی طرح خوبصورت ہیں اور یوں ہلکے رنگوں اور سردیوں کی دھوپ جیسی یہ شاعری قاری کو آسودگی کی منزلوں کی طرف لے جاتی ہے یہ دکھوں کی تہذیب ہے اور میں شہناز مزمل کو اس ارفع رویے کی شاعری پر مبارک باد دیتا ہوں

عطاء الحق قاسمی

شہناز مزمل ایک شائستہ اور شستہ خاتون ہے۔ ان کا شریفانہ اسلوب شعر ایک مثبت تاثر دل پر طاری کرتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ساتھ ذرا دیر سے ادبی دنیا میں ظاہر ہوئی

ہیں مگر اتنی ہی جلدی ایک مقام بنانے میں کامیاب رہی ہیں کہا گیا ہے کہ کتابیں گھروں کی طرح ہوتی ہیں ان میں رہنا چاہئے ۔ شہناز شاعری کو بھی ایک اچھے گھر کا منظر دینا چاہتی ہیں۔ ادبی دنیا میں ان کی موثر موجودگی ایک اعزاز کی طرح ہے۔ بلاشبہ وہ ایک معزز شاعرہ ہیں۔

ڈاکٹر اجمل نیازی

جس معاشرے میں عورت کی تخلیقی گواہی کو رد کرنے کی روایت پڑ جائے ۔ وہ معاشرہ تہذیبی، سماجی اور ثقافتی سطح پر بانجھ ہو کر رہ جاتا ہے۔
ہماری تیسری دنیا کے زیادہ تر معاشروں کی بد نصیبی رہی ہے کہ ہم نے تخلیق کی بجائے تقلید کو اپنی زندگی کا چلن بنا رکھا ہے ۔ ہم آنکھیں بند کئے دوسروں کو دیکھتے ہوئے خوابوں میں اسیر رہتے ہیں اور ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ہماری پلکوں سے کسی نئے خواب کی پرچھائیں نہ چھو جائے۔
شہناز مزمل ہماری ایسی غیر تخلقی روایت میں لفظ اور خواب کے حوالے سے ایک زندہ اور تخلیقی گواہی بن کر ظاہر ہوئی ہے ۔ ان کی شاعری ہماری تہذیب کے کھنڈر سے طلوع ہوتی ہوئی کسی صبح کی مانند ہے ۔ سچی اور خوبصورت۔

نذیر قیصر

شہناز مزمل صاحبہ کی شاعری

اردو ادب میں ادبی ماضی سے تعلق رکھنے والے شاعر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو ماضی یا گزشتہ سے پوستہ اقدار و روایات میں سانس لیتے ہیں۔ عہد ماضی اپنے اوپر اوڑھ لیتے ہیں ،عصری تقاضوں' ماحولیات اور اردگرد کی دنیا و حالات پر نظر ڈالتے ہوئے تذبذب کا شکار ہوتے ہیں یا پھر عصری تقاضوں کے چیلنج سے گھبراتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو اپنے زمانے سے قطع تعلقی پر اتر آتے ہیں۔

آراء

۱۔ منیر نیازی
۲۔ انیس ناگی
۳۔ روحی کنجاہی
۴۔ عطاء الحق قاسمی
۵۔ ڈاکٹر اجمل نیازی
۶۔ نذیر قیصر
۷۔ کرامت بخاری
۸۔ سعد اللہ شاہ

معاشرے میں کوتاہیوں اور بگاڑ کا احساس۔ ایک بڑے آورش اور اعلیٰ انسانی اقدار سے وابستگی ۔ مذہب اور وطن سے محبت۔ مثالی بود و باش کی خواہش ' ایک نامہربان آس پاس میں ایک غمگسار اشارہ یہ ہے شہناز مزمل کی شاعری خوبصورت مستقبل کی آس کے ساتھ۔

منیرنیازی

"شہناز مزمل اردو شاعری میں جانا پہچانا نام ہے ۔ پانچویں شعری مجموعہ کی اشاعت ان کے تخلیقی عمل کے اصرار کی شہادت ہے۔ فی زمانہ غیر رسمی شعری اسلوب میں شعر لکھنا ایک جہاد سے کم نہیں ہے۔ شہناز مزمل نے یہ جہاد اپنی نظموں میں کیا ہے ۔ ان کی آزاد نظموں میں ایک جذباتی روانی ہے جو ان کے اپنے موضوع سے قرب کا یقین دلاتی ہے۔ ان کی نظمیں خود آگہی کا سفر ہیں' وہ اپنی نظموں کے ذریعے اپنی محصور ذات کو دریافت کرتی ہیں' یہ دریافت رومانی اور مابعد از طبعاتی نہیں 'ارضی اور حقیقی ہے

شہناز مزمل کی نظمیں جو جذباتی سطح مرتب کرتی ہیں ان میں معاصر ناہموار زندگی کی رنگت اور فرد کی ازلی مجبوری کا عکس بھی دکھائی دیتا ہے"

انیس ناگی

شہناز مزمل انتہائی حساس اور باشعور شاعرہ ہے۔ اس کا کلام ہجرو فراق کے درد و گداز اور تلاش و جستجو کے کرب مسلسل کا آئینہ دار ہے ۔ شہناز مزمل دکھ کے انتہائی گہرے ہیں۔ اس کا اظہار خوبصورت اور دل نشیں ہے۔ اس کی غزلیں اور نظمیں دلوں کے دروازوں پر دستکیں دیتی محسوس ہوتی ہیں۔

شہناز مزمل کے کلام کا سب سے نمایاں وصف اظہار کی سچائی اور بے ساختہ پن ہے۔ وہ لفظی' بازیگری اور تکلفات کی قائل نہیں' اس کا کلام قاری کے دل و دماغ کو

نے میری کتابیں شائع کیں ان کی یہ پہلی اشاعت تھی جو ان کے لئے سنگ میل ثابت ہوئی اور یہ بات اطمینان قلب کا باعث تھی کہ کسی کو تو فائدہ پہنچا۔ تینوں کتابوں کی پانچ پانچ سو کاپیاں شائع ہوئیں اور جب کتابیں مارکیٹ میں بھیجنے کا وقت آیا تو علم ہوا کہ سٹاک میں صرف تیس یا چالیس کتابیں موجود ہیں اور باقی احباب میں "تحفتاً" تقسیم کردی گئیں۔ بہر حال سود و زیاں اپنا تھا اس لئے پرواہ نہ کی۔ ارادہ کیا کہ چوتھی کتاب پر سرمایہ کاری پبلشر کی ہو تاکہ کتابوں کو یوں بے دردی سے تقسیم نہ کیا جاسکے۔ ان ہی دنوں انوار صاحب سے ملاقات ہوئی جو ذیشان بک پیلس کے نام سے اپنے ادارے کا آغاز کر رہے تھے اور چند کتابوں کی ابتدائی تیاریوں میں مصروف تھے اور پھر وہی حسن اتفاق کہ "عکس دیوار پہ تصویر" ان کی ہی پبلشنگ کی ابتدا ثابت ہوئی ۔ انوار صاحب بہت دھیمے مزاج کے انسان ہیں۔ کم گو' معاملے کی بات بھی آسانی سے نہ کرسکنے والے اور یوں طریق کار پھر وہی رہا میں ان سے لے کر کتاب "تحفتاً" تقسیم کرتی رہی۔ ان کے ذاتی تعلقات اتنے زیادہ نہ تھے جس کی وجہ سے کتاب صحیح طور پر مارکیٹ نہ ہوسکی ۔ لیکن خطوط دور دراز سے ملتے رہے جس سے انداز ہوا کہ کتاب سرحد اور بلوچستان تک پہنچی۔ اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ مجلس معین ادب فیصل آباد نے ۲۱ فروری ۱۹۹۱ء کو اس کی تقریب رونمائی کروائی۔ فروری ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر وحید قریشی کی صدارت میں ایک شام منائی گئی اور بہت سے مضامین بذریعہ ڈاک بھی مجھے ملے۔

پھر "میرا خواب ادھورا ہے" کو پورا کرنے کے لئے "رتجگوں کی مسافت بھی کاٹی" "سفر خود آگہی" اور "جرم آگہی" کے کرب سے بھی گزری۔ "کسک" اور "بے کلی" بڑھتی گئی۔ "برزخ احساس" میں جلتی رہی۔ لیکن "خواہش نادیدہ" کے ساتھ ساتھ "لاحاصلی کی سرزمیں" پر چلتی ہوئی مختلف "زاویئے" بناتی رہی مگر ادھورا خواب پورا نہ ہوا اور "آنے والے کل کا خوف" سوال بن کر ساتھ ساتھ رہا اور یوں "بے نام خواہش" کی الکھ نگری سے گزر کر موم کے سائبان تک پہنچ گئی۔

دوران سفر طارق صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے "موم کے سائبان" آپ تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کی اور جب مسودہ میں نے ان کو دیا تو انکشاف ہوا کہ اردو شاعری کی ان کی بھی یہ پہلی کتاب ہے اور یوں ایک دفعہ پھر اپنا قیمتی سرمایہ طارق صاحب کے سپرد کر رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ اس دفعہ انشاء اللہ یہ کتاب سب تک ضرور پہنچے گی۔

موم کے سائبان تیار ہیں اور میں اب یہاں سے نکلنا چاہتی ہوں کیونکہ ان کو بناتے ہوئے اتنا پگھلی ہوں کہ اب ذرا سی تپش بھی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔

آپ کی پر خلوص پذرائی سے ' مشوروں سے ' خطوط سے جو ہر مجموعے کی اشاعت کے بعد مجھے ملتے ہیں انشاء اللہ میں دوبارہ اس قابل ہو جاؤں گی کہ "میرا خواب ادھورا ہے" پورا کرکے ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکوں۔

اپنے بارے میں خود تو بتا چکی اب دیکھتے ہیں کہ احباب کی میری شاعری کے بارے میں کیا رائے ہے۔

شہناز مزمل

۳-۱-۹۴

۱۲۵- ایف ماڈل ٹاؤن لاہور

کچھ اپنے بارے میں

جذبوں کی تیز آنچ سے قطرہ قطرہ پگھلتی رہی۔ جذب و حروف کے بعد جرات اظہار اور پھر عکس دیوار پہ تصویر بنا کر بھی ادھورا خواب ابھی تک پورا نہیں ہوسکا ۔ لیکن موم کے سائبان بنتے رہے ان سائبانوں کی تکمیل سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ڈرتی ہوں کہ موم کے یہ سائبان میرے دل کی آنچ کے ساتھ ساتھ آپ سب کے دلوں کی آنچ سے پگھلنا شروع ہوگئے تو آنکھوں کے سامنے دھند چھا جائے گی اور پھر شاید ہم ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکیں اور اپنے اپنے کرب کی شدت سے خود ہی موم ہو جائیں۔

بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر کہوں گی نہیں۔ کیونکہ پھر موم کے سائبان کچھ نہ کہہ سکیں گے ۔ ہاں! چند سوالوں کی وضاحت ضرور کروں گی جو اکثر مجھ سے کئے جاتے ہیں۔

اب تک میری آٹھ کتابیں شائع ہوچکی ہیں اس میں سے چار شعری مجموعے ہیں اور ۴ تحقیقی موضوعات ' پانچواں شعری مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

میرے باقاعدہ ادبی سفر کا آغاز ۱۹۸۹ء میں والد صاحب کی وفات کے بعد ہوا۔ والد مرحوم حشرالقادری خود شاعری تھے گویا شاعری ورثے میں ملی۔ حضرت علامہ اقبال سے متاثر تھی تو پہلی کتاب اسی طرز پر پیام نو کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ ایڈیشن لائبریریوں تک محدود رہا۔

حوصلہ افزائی ہوئی تو جذبوں نے حرف پہنے اور جذب و حروف کا پیکر سامنے آیا تو پھر جرات اظہار کا قرینہ بھی آگیا اور یوں جذب و حروف اور جرات اظہار ساتھ ساتھ منظر عام پر آئیں۔ اور اس کے بعد آنے والے مجموعے کے لئے "میرا خواب ادھورا ہے" کا اعلان کیا گیا مگر خواب ادھورا رہا اور عکس دیوار پہ تصویر بن گئی۔ پہلا پہلا تجربہ اور شوق مہنگا پڑتا ہے سرمایہ کاری بھی خود کی کیونکہ کتابیں احباب میں تقسیم کرنے کو ہی چاہتا تھا اور پبلشر کی سرمایہ کاری سے ایسا ممکن نہ تھا۔ مزے کی بات یہ کہ شعری سرمایہ بھی اپنا اور سرمایہ کاری بھی اپنی' نام پبلشر کا۔ حسن اتفاق کہ تینوں پبلشر جنھوں

منصوبے بناتی ہے ' پیمان باندھتی ہے ' وہ اس کی موجودگی میں خود کو محفوظ تصور کرتی ہے ' اس سے اس کی دوسروں پر بے یقینی بھی منعکس ہوتی ہے ' تاہم اس نے جاناں کو تنہائی بنا کر اپنی ایک دنیا بسائی ہوئی ہے۔

یہ بات مذکورہ بالا کائناتی حوالے کو تقویت دیتی ہے۔ وہ خود کہتی ہے۔

بادل سا ہوں وجود مرا آسمان پر
میں بھی ہوا کے دوش پہ ہر سو اڑا کروں

میں بھی زمیں کے پانیوں پر عکس بن سکوں
میں اس کی موج موج میں خود کو بکھیر دوں

گہرے حسین ساگروں کے ساتھ بہہ سکوں
میں تہہ میں اس کی سیپیوں کے ساتھ رہ سکوں

جی چاہتا ہے خود پہ مجھے اختیار ہو
یہ آبشار جھرنے یہ بادل برس پڑیں

یہ تتلیاں' یہ جھیل ' سمندر یہ کہسار
خود اپنی وسعتوں میں مجھے بھی سمیٹ لیں

اس حوالے سے شہناز رومانٹک شاعروں Romantic Poets کی صف میں آجاتی ہیں (انگریزی تنقید میں رومانٹک سے مراد صرف رومانوی نہیں) مثلاً"
Keets Shelley اور Words Worth کی شاعری میں کچھ اس طرح کی کیفیت

دیکھی جاسکتی ہے Shelly اپنی ایک نظم West Wind میں کہتا ہے

Oh Lift me as a wave a leaf a cloud!

I fall upon the thorns of life! I bleed!

یہ اسلوب ہر بے چین فنکار کا ہونا چاہئے۔ شہناز بھی فصیل جان میں مقید طلسم جاں کا عذاب سہہ رہی ہے اور دائمی سکون کی متلاشی ہے۔ وہ Dr.Fausties کی طرح طاقت کا حصول شیطانی طاقتوں کے ذریعہ نہیں کرنا چاہتی۔ وہ دست دعا پھیلاتی ہے اور خدا سے اپنے لاڈلے انداز میں شکوہ بھی کرتی ہے۔

ہو گر اجازت تو پوچھنے کا
مجھ بھی اتنا تو حق ہے حاصل
مرے لئے گر نہیں تھا کچھ بھی
کوئی ستارا
کوئی کنارا
تو کیوں سجائی تھی بزم ساری

شہناز مزمل اپنے اندر حوصلہ بھی خود ہی پیدا کرتی ہے ' وہ بہت باہمت دکھائی دیتی ہے۔

فضائیں دھند میں لپٹی ہوئی ہیں
تجھے پرواز کرنا ہے
تجھے پر کھولنا ہونگے
تجھے در کھولنا ہونگے

شہناز کی اور بہت سی خوبصورت نظمیں ہیں جو دیباچے کی طوالت کے باعث کوٹ نہیں کی جاسکتیں۔

شہناز مزمل کے ہاں غزل بھی اچھی ہے مگر اس پر بھی نظم کا رنگ غالب ہے ' اسے نظم کا شاعر کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ سب سے خوشی کی بات یہ کہ اس نے بے بہا جذبوں اور بے شمار موضوعات کے باوجود نثری نظم کا سہارا نہیں لیا۔ یقیناً" وہ سمجھتی ہے کہ شاعری اور نثر دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ آج کی نثری نظم افضال سید' انیس ناگی اور نسرین انجم بھٹی تک تو مانی جاسکتی ہے وہ بھی ٹھاٹ کی حد تک۔

بعض جگہ اس نے غزل بھی نہایت خوبصورت انداز میں کہی ہے ' ایک جداگانہ طریقے سے

اتنا احساس ندامت نہ دلایا جائے
فیصلہ جرم کا اک بار سنایا جائے

زرد رت کا فضا پہ پہرہ ہے
موسم گل کہاں پہ ٹھہرا ہے

گرد دو جہاں میں رہتی ہوں
ہر گھڑی امتحاں میں رہتی ہوں

یہ چشم تر مری پتھرا گئی تو کیا ہوگا
یقیں کی آخری حد آگئی تو کیا ہوگا

تلاشِ جذب میں دنیا تیاگ سکتی ہوں
سکوت دشت سے گھبرا گئی تو کیا ہوگا

تھے عجیب میرے بھی فیصلے میں کڑی کماں سے گزر گئی
رہے فاصلے مرے منتظر میں تو جسم و جاں سے گزر گئی

اس شعری مجموعے میں شہناز مزمل نے بھرپور شاعری کی ہے اور وہ تخلیقی سطح پر شعر کہنے کے لطف اور کرب کو ساتھ ساتھ محسوس کرتی ہے یقیناً" وہ بڑی توانائی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے تو ہم اس سے اچھی توقعات رکھتے ہیں۔

سعداللہ شاہ

کوچۂ جاناں

کیوں کوچۂ جاناں سے اشارا نہیں آتا
مجھ کو درِ طیبہ سے پکارا نہیں جاتا

ہوں گوش بر آواز ملے اذن حضوری
دکھ دوریِ طیبہ کا سہارا نہیں جاتا

موم کے سائبان

سکوتِ شام میں بجتی ہوئی گھنٹی کی آوازیں
افق میں ڈوبتے سورج کی سرخی
فضا میں تیرتے بادل کے ٹکڑے
اور بدلتی رُت کی خوشبو
وہی منظر
کسی سپنے کی صورت آنکھ کی پتلی میں رہنے دو
ہجومِ بیکراں ہے
کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا
کسی برگد کا دکھ
اور ڈار سے بچھڑی ہوئی اک کونج کی لمبی اڑانوں کو
کہ سب کے سب تو خود کھوئے ہوئے ہیں

اور اپنی ان چمکتی تیز آنکھوں کو مچانوں پر سجایا ہے
تو یوں تاریکیاں اندر ہی اندر بڑھتی جاتی ہیں
سلاسل یاس کے پھیلے ہوئے ہیں
سمندر دور۔ دریا دور بادل دور ہیں جاناں
کڑی ہے دھوپ منزل بے نشاں ہے
کسی دیوار کا سایہ
کوئی بارانِ رحمت کی ردا سر پر نہیں ہے
کہ جتنے سائباں ہیں سب کے سب ہیں موم کے جاناں
ہجومِ بیکراں ہے
اور اب ان سائبانوں میں
جو جلتی آگ سے قطروں کی صورت بہہ رہے ہیں
اماں کس کو ملے گی؟
کون ٹھہرے گا یہاں؟
ہجوم دھر کو کیا ہوگیا ہے
کہ ہر اک آرزو کو جستجو کو ختم کر کے
اپنی آنکھوں کو مچانوں پر سجایا ہے

جرمِ آگہی

رقص ہے شعلوں کا
اور
دامن دریدہ ہے مرا
اے دریدہ دامنی مجھ کو بتا
سر بریدہ خواہشوں کو ساتھ لے کر
حرفِ نامعلوم کو معلوم کرنے کیلئے
رت جگے کے کرب جھیلوں
اور سلگتی رہ گزر پر
منزلوں کے راستوں کے شوق میں
بے ارادہ نیم جاں سرگوشیاں کرتی رہوں
جب کسک زخموں کی خود ہی

پھر چبھن دینے لگے
اپنے ہی ہاتھوں سے
ہر اک زخم کو گہرا کروں
کربِ نامعلوم کو محسوس میں کرنے لگوں
حرفِ نامعلوم کو معلوم کرنے کیلئے
میرا جرمِ آگہی
میری سزا بنتا ہے کیوں
اے سکوتِ منجمد
تھوڑا پگھل
میں صلیبِ وقت پر مصلوب ہوں
کس قدر مجبور ہوں
میں ازل سے ہوں سفر میں
منتظر ہوں
کون جانے کونسا رستہ ہے یہ
کون جانے آگہی کا جرم اب
کونسا رستہ مجھے دکھلائے گا
منزلوں کا شوق پہلے بھی نہ تھا
اور رستہ کسطرف لے جائے گا

وقت ظالم کب پلٹ کر آئے گا
اے دریدہ دامنی مجھ کو بتا
رقص کیا شعلوں کا بڑھتا جائے گا
ہاتھ ایسا کونسا اب آئے گا
زخم پر مرہم مرے رکھ جائے گا
اے دریدہ دامنی مجھ کو بتا
کس قدر باقی ہے اب میری سزا

ابھی سورج کو جلنا ہے

ابھی سورج کو جلنا ہے
ابھی رستوں کو چلنا ہے
ابھی اس جانفشاں نے
سب اندھیروں کے لئے برسوں
یہ گولا آگ کا یوں ہی بوقتِ صبح اگلنا ہے
اگر سورج ہی بجھ جائے
تو کیسے راستے ہوں گے؟
سکوں سورج کو تو مل جائے گا
ویرانیاں ہوں گی
یہ سب حشرات جن کو رب نے بینائی نہیں بخشی
انہیں سورج دیا ہے

اسی کی روشنی کی لو کو لے کر
وہ نکلتے ہیں
اندھیری راہ چلتے ہیں
یہ سورج جل تو سکتا ہے
یہ سورج مر نہیں سکتا
یہ سورج روشنی کا اک قدیمی استعارہ ہے
اسی نے اس کو مارا ہے
میں اپنے ناتواں کندھوں پہ اک دیوار چنوا کر
اسے مرنے نہیں دوں گی
میں اس کی قرمزی کرنوں کو خود میں قید کر لوں گی
میں خود جلنے لگوں گی
روشنی اس کی بکھیروں گی
یہ سورج مجھ کو پیارا ہے
یہ سورج مجھ کو پیارا ہے

مری ہتھیلی پہ خواب دینا

دھکتے لمحوں سے بچ نکلنے کا
راستہ میں تلاش کرلوں
مگر یہ لمحے جو خود سلگ کر
در آئے ہیں آج میرے اندر
جواب مجھ سے طلب کریں گے
کہ ہم نے تیری ہی حسرتوں کے
چراغ روشن کئے تھے ہر دم
مزارِ حسرت دیا تھا تو نے
دھکتے لمحے جواب ہوں گے
مری تمنا کا جستجو کا
مری ہتھیلی پہ خواب ہوں گے

ادھورے ان کے جواب ہوں گے
دھکتے لمحو جواب دینا
مری ہتھیلی پہ خواب دینا

لاحاصلی کی سرزمین

کوچۂ لاحاصلی میں
اونگھتی آنکھوں کے ساتھ
بند ذہنوں کے دریچے وا کیے
منتظر ہم کس کے ہیں
کیا کوئی اترے گا پھر سے
جگنوؤں سے پوچھنے
کتنے کم مایہ ہو تم
پر روشنی تم میں ہی ہے
کتنے ہی شب زاد ھیکل
تیرگی کے جنگلوں میں کھو گئے ہیں
روشنی کی جو کرن

روشن تمہارے تن میں ہے
کیا کسی شب زاد کو
گم کردہ منزل کا نشاں دکھلائے گی
اور پھر لاحاصلی کی سرزمیں
کوئی حاصل لائے گی

کڑی سزا

جُرمِ الفت پہ بگڑتے ہوئے لوگو سوچو
جُرمِ الفت ہی تو تعزیرِ جہاں بانی ہے
عہدِ گم گشتہ کی اک لاش مرے ساتھ بھی ہے
ساتھ میرے بھی رہے ہیں مرے ماضی کے عذاب
خواب ریزہ ہیں مرے کیسے میں تجسیم کروں
کسطرح خواب بنوں خوابوں کی تعبیر چنوں
منتشر ایسا ہے شیرازۂ ہستی جاناں
محورِ زیست بھی ملتا نہیں مجھ کو جاناں
کون سے دیس سے میں آکے یہاں ٹھہری ہوں
کون مقصود مرا کون مری منزل ہے
لذتِ رزق نے جنت سے نکالا مجھ کو

اور گلرنگ عذابوں میں ہے ڈالا مجھ کو
کتنے شداد یہاں کتنے ہیں منصور یہاں
کتنے ٹکڑوں میں بٹا جاتا ہے انسان یہاں
مجھ سے فردوسِ بریں چھین کے دنیا بخشی
مجھ کو کیوں حُکمِ سفر دے کے نکالا تو نے
مجھ کو صد رنگ جھمیلوں میں ہے ڈالا تو نے
اے خدا، اتنی سزا، اتنی سزا، اتنی سزا
مجھ سے کٹتی نہیں دنیا کے خداؤں سے بچا

رتجگوں کی مسافت

بہت لمبی مسافت
رتجگوں کی میں نے کاٹی ہے
کسی بھی پر سکوں ساعت کا
کوئی بھی حسیں لمحہ
مری بے خواب آنکھوں میں اتر آئے
کہ اب تو
ضبطِ گریہ جان لیوا ہوتا جاتا ہے
میں اک گرتی ہوئی دیوار کی مانند
شکستہ ہوں
اور اک لمبی مسافت کی تھکن سے
بدن دکھنے لگا ہے

سانس قابو میں نہیں آتی
یہ کیسا حبس موسم ہے
کہ جس نے روح کو گھائل کیا ہے
ہیں اتنے زخم سینے پر
کہ اب گننا بھی مشکل ہے
کوئی آنسو نہیں ٹپکا
کسی ارماں کے مرقد پر
کہ ہم بھی کربلائے ذات کے قیدی رہے ہیں
مگر تو جانتا ہے
کچھ بھی ہو
کیسا بھی ہو
احساس کی تلخی کا کتنا بوجھ ہوتا ہے
مرے اپنے بنائے ریت کے گھر
اور
مٹی کے کھلونے راہ میں بکھرے پڑے ہوں
کبھی شکوہ نہیں ہوتا
کبھی ماتم نہیں ہوتا
یہ کیسا رتجگا ہے۔

یہ بے خوابی سی کیسی
آج آنکھوں میں اترتی ہے
کہ یہ دُکھتابدن
اُکھڑتی سانس کہتی ہے
کوئی خوابِ حسیں ہی بھیک میں مجھ کو کبھی دے دے
وگرنہ اے خدا یہ زندگی لے لے

مٹی

مٹی لے کر ہاتھ میں اپنے
کب سے بیٹھی سوچ رہی ہوں
میں بھی مورت مٹی کی ہوں
مجھ کو ڈھالا رب نے میرے
میں یہ مٹی کیسے ڈھالوں
کوزے ڈھالوں
یا بت ڈھالوں
گھر میں لگواؤں
گور بناؤں

مٹی یہ بھی
مٹی میں بھی
کیوں نہ اب میں دور کی سوچوں
مٹی کھیلوں مٹی پہنوں
اور مٹی ہو جاؤں

بے کلی

میں اس قدر مضطرب سی کیوں ہوں
یہ بے کلی میری روح میں کیوں اتر گئی ہے
میں پوچھتی ہوں
ہر اک سے جاناں
مجھے بتاؤ قصور میرا
میں جانتی ہوں
کہ آگہی کا یہ گہرا ساگر
مجھے ہی آواز دے رہا ہے
مگر نہ جانے میں آجکل کیوں
عجیب سا شہرِ بے صدا ہوں
مرے تصور کے سب جزیرے بھی منجمد ہیں

میں وقت کی ڈور میں بندھی ہوں
اُلجھ گئی ہوں
میں سوچتی ہوں سراب ہے سب
یہ آگہی بھی عذاب ہے اب
تمھیں بتاؤ نا کیا کروں میں؟
اگر میں آنکھوں کو بند کرلوں
کوئی بھی آواز سن نہ پاؤں
مگر یہ آنکھیں جو میرے اندر چمک رہی ہیں
میں سو بھی جاؤں
یہ جاگتی ہیں
سلگتا رہتا ہے ذہن میرا
یہ آئینہ سا
جو میرے اندر لگا ہوا ہے
مجھی کو قیدی بنا رہا ہے
میں جب بھی موسم کی تلخیوں سے
ان الجھنوں اور نفرتوں سے
پناہ چاہوں
تو موند لیتی ہوں اپنی آنکھیں

بتاؤ ناتم کہ کیا کروں میں؟
کہ میرے اندر چمکتی آنکھوں
کی تیز کرنیں
پلٹ کر آتی ہیں آئینے پر
تو دیکھتی ہوں
کہ جتنے بھی عکس ہیں ادھورے
کہ جتنے بھی نقش ہیں ادھورے
تمام روشن لباس پہنے
قطار باندھے
اتر رہے ہیں
ہر ایک خواہش کے عکس جاناں
بڑھاتے ہیں اضطراب اکثر
اتارتے ہیں عذاب اکثر
میں تھوڑی سی دیر سونا چاہوں
گرا کے چلمن کو رونا چاہوں
نہ سو سکوں میں نہ رو سکوں میں
تمھیں بتاؤ کدھر میں جاؤں
سکون آخر کہاں میں پاؤں
کہاں پہ یہ آئینے چھپاؤں

برزخِ احساس

عکس پنہاں ہے ترے شہر کا ان آنکھوں میں
جاگتی آنکھوں میں سپنے ہیں سجائے میں نے
میں ہوں سودائی مجھے برزخِ احساس میں آج
اپنی ہر ایک تمنا کو جلانا ہو گا
تجھ سے تجدیدِ محبت کا تقاضا کیسا
اپنا ہر نقش مٹا کر تجھے پانا ہو گا

کسک

میرے دل میں کسی گزرے ہوئے لمحے کی کسک
جانے کیوں آنکھ کی پتلی میں اتر آئی ہے
ہر گھڑی گھٹتی ہوئی قوتِ گویائی کو
کوئی جذبہ کوئی احساس ہی بخشا جائے
چار سو پھیلا ہوا مرگِ تمنا کا سکوت
منتظر ہے کسی ناقوسِ مسیحائی کا
دل تمناؤں کے گرداب میں پھنس جاتا ہے
اور امید بدل لیتی ہے ملبوس نیا
بھانپ لیتی ہے مری آنکھ بہت مشکل ہے
کوئی آواز کوئی رنگ کوئی بھی تجسیم
شوق کی راہ میں مہمیز نہیں ہو سکتی

خواب تو خواب ہیں بنتے ہیں بکھر جاتے ہیں
نقش رہ جاتے ہیں اور نقش ادھورے شہناز
جان کا روگ چبھن روح کی بن جاتے ہیں
میرے دل میں کسی گزرے ہوئے لمحے کی کسک
جانے کیوں آنکھ کی پتلی میں اتر آئی ہے

زرد موسم کے عذاب

شام نگر ہو
اور یہ سورج
جھیل کنارے ڈوب رہا ہو
سرخ ردا میں
لپٹا چہرہ
دھیرے دھیرے
بھیگ رہا ہو
بھیگی رت ہو
سرد ہوا ہو
اور جذبوں سے عاری چہرہ
زرد ہوا ہو

پردیس میں

یہ وقت سمندر ہے لمحات کی بارش ہے
جذبات کو تم اپنے سینے میں دبالینا
پردیس میں چہرے پر اک خول سجالینا
چپ چاپ سے آنسو کو پلکوں میں چھپالینا
کب درد کوئی سمجھے کب کرب کوئی جانے
یادوں کے جزیرے میں دھیرے سے بکھر جانا
گر یہ نہ ہو بارش کا نوحہ نہ ہوا کا ہو
پلکوں پہ کوئی تارا چمکے نہ کسی لمحے
سوئے ہوئے رستوں پر برفاب سے موسم میں
بس چاپ ہو قدموں کی
گل ریز فضاؤں سے خوشبو کو چرالیا

مہکی ہوئی کلیوں سے کمرے کو سجا لینا
ساجن کے تصور میں چپکے سے سنور جانا
ہونٹوں پہ ہنسی لے کر زینے سے اتر جانا

شب گزیدہ

شب گزیدہ کے لئے آج تو دشوار ہے رات
کچھ سفر اور ابھی اور سفر باقی ہے
ہجر کا کرب لئے دکھ کے سمندر کی طرف
کوچۂِ شہرِ تمنا سے گزرنا ہوگا
کون سمجھے گا مری روح کے آزار کو آج
کون ہمدم مری تنہائی کا ہوگا جاناں
کون آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے موتی چن کر
میرے احساس کی تلخی کو کرے گا مدھم
جسم ہی جسم ہے اب روح کہاں ہے اس میں
ان گنت سوچوں کے سورج سے جھلستا یہ دماغ
کس طرح درد سے پھٹتی ہوئی شریانوں کو

کوئی مرہم کوئی تریاقِ شبِ غم دے گا
کچھ نہ کچھ اترے کہیں سے کہ شبِ غم گزرے
شب گزیدہ کے لئے آج تو دشوار ہے رات
کچھ سفر اور ابھی اور سفر باقی ہے

سرد سناٹا

بہت ہی خامشی سے
کٹ رہے ہیں دن مرے جاناں
نہ کوئی سوچ میں ہلچل
نہ کوئی بات انہونی
رگ و پے میں اترتے سرد سناٹے نے
مجھ کو کردیا جامد
خدایا!!
برف سوچوں کو مری پگھلا
نیا سورج جلا کر
میری یخ بستہ سی سوچوں کو روانی دے
مرے افکار کو مربوط کر اور زندگانی دے

احساس کی زنجیر

خوشبو نے ہر اک سمت بکھیرے ہیں نئے رنگ
موسم کا طلسم آج جگاتا ہے کئی زخم
احساس کی زنجیر مجھے باندھ رہی ہے
ہے شور فضا میں کوئی طوفان اٹھا ہے
سرکش ہے ہر اک موج کوئی راہ نہیں ہے
کوئی نہیں دیوار خلا میں نہ کنارا
گزرے ہوئے لمحوں کی خلش آج مجھے کیوں
سوئی ہوئی تقدیس کا احساس دلا کر
تنہائی کے جنگل کی طرف کھینچ رہی ہے
لمحوں سے بھرا ہاتھ میں پیمانہ لیئے میں
اپنا ہی کوئی عکس یہاں ڈھونڈ رہی ہوں

دمِ فیصلہ

صوبِ تاریک پر کھڑی ہو کر
قُفلِ ابجد نہ کھول پاؤں میں
سامنے لمحۂ معاد بھی ہے
کیوں دمِ فیصلہ ہوں لب بستہ
اسمِ اعظم سے در نہیں کھلتے
دور خود یافتی کی منزل ہے
ڈھونڈ لوں اب فرار کا رستہ

منتظر آنکھ

(۱)

بہت زمانے سے ہے آنکھ منتظر میری
نہ جانے کتنے دنوں سے پلک نہیں جھپکی
نظر سے ٹوٹ گئے سارے خواب کے رشتے
سماعتیں ہیں مری کب سے گوش بر آواز

○

اپنی دہلیز پہ آہٹ وہی سننا چاہیں
ربطِ باہم بھی نہیں دل یہ بھلا کب مانے
ایسا اندازِ تغافل وہ بھلا کیا جانے
چاند بھی بجھ سا گیا تارے ہیں مدہم جاناں

کیا کروں دل یہ کسی طور بہلتا ہی نہیں
میں بھی بے چین ہوں تم اسکا یقیں کر لینا
کاسۂ چشم ترے پاس اگر درپن ہے
اسکا رخ شہرِ تمنا کی طرف کر دینا
جب تو جھانکے گی تصور کے حسیں روزن سے
بے قراری کو تری تھوڑا قرار آئے گا
دل کے ویرانے میں بس ایک دیا روشن ہے

بے نام خواہش

میں اپنے ساتھ رہنے کے لئے۔
بے تاب ہوں جاناں۔
کوئی تو وقت ایسا ہو۔
کہ جب ڈھلتی شفق کی جھلملاتی ڈوبتی کرنیں
فضا کی خامشی میں سحر پھونکیں اور۔
حسیں پربت کے سائے میں
ترنم آفریں جھرنوں کے جھرمٹ میں
اترتی سرد سی اک شام ہو جاناں
رگوں میں منجمد ہوتا لہو ہو
میں ساکت بیٹھ کر کچھ دیر
اپنے آپ کو دیکھوں

کچھ اپنے آپ سے بولوں
ذرا سی دیر میں رو لوں
کسی بھیگی ہوئی رت میں
شفق آگیں حسیں وہ شام
میری روح میں اترے
اور اسکی نرم آہٹ دھیمی ٹھنڈک
دیر تک محسوس کر کے میں
الاؤ تلخیوں کے نفرتوں کے سرد کر ڈالوں

کربلا کے نام

سب ایک مرکز و محور کو ماننے والے
حصارِ ذات میں محصور ہو گئے سارے
وہ چلچلاتی ہوئی شام تھی فرات کے پار
شبِ سیہ میں کوئی کارواں اترتا تھا
نہ منزلوں کے نشاں کوئی پاسبان نہ تھے
سروں پر قافلے والوں کے سائبان نہ تھے
فضا میں سارے پرندوں نے سانس روکی تھی
خموش آنکھوں سے وہ التجا کناں تھے وہاں
ہمیں بھی اپنے پروں کو پکھیر لینے دو
بدلتی رت میں ہوائیں بکھیر لینے دو
تھے حکمِ ربی کے واں منتظر فرشتے بھی
پروں کو اپنے جو پھیلائے سائباں بنتے
امنڈتی موت کے رستے میں آسماں بنتے

تھا کون روکے جو منہ زور وقت کی ٹاپیں
فگار ہوتی رہیں کربلا کی سب راتیں
تھے سر بریدہ کئی جسم بے کفن لاشیں
اُگل رہی تھی زمیں آگ آسماں چپ تھا
زمینِ کربلا رنگین تھی جہاں چپ تھا
شہید ہونے کو آئے تھے شاہد و مشہود
کہ سب گمان سے نکلیں یقیں رہے موجود
شہادتوں پہ کمربستہ سب رہے مسجود
سکوتِ مرگِ مسلسل تھا چار سو چھایا
فغاں سے شق ہوئے سینے پہ لب رہے خاموش
ردائیں چھن گئیں کیسا یہ مرحلہ آیا
فراتِ جاں کو سپردِ فرات کر ڈالا
یزیدیوں کو شہادت سے مات کر ڈالا

عہدِ منحرف

کیوں مکدر ہے آئینہ سا وجود
نقش سارے جو مرتسم تھے یہاں
آج اس عہدِ منحرف میں چھپے
کیوں عیاں مجھ پہ ہو نہیں سکتے
گنبدِ خوف سے نکل آؤ
منزلوں کی بشارتوں کے لیئے
منتظر ہیں سماعتیں میری

اجنبی سرزمیں

رہ گزر خاموش ہے
اور درختوں سے گرے پتے زمیں پر
بڑھتے قدموں کے تلے نوحہ کناں ہیں
سرد سرما کی یہ کہر آلود شب
اور ہوا کے دوش پر شہرِ جمال
کتنا پر اسرار ہے
سوچتی ہوں آج پوچھوں
رہ گزر سے منجمد پانی سے
اور
اس پر تیرتی کائی میں اگتی گھاس سے
خشت و گِل سے موسموں کے سحر سے

کیا کبھی اس شہر میں سورج کی جولانی نظر آئی بھی تھی
پتھروں کے شہر میں پھولوں کی ہے بہتات کیوں
نیلگوں یہ آسماں روتا ہے کیوں
لوگ زندہ ہیں یہاں آزاد رہنے کے لئے
بوجھ اپنا بانٹتے ہیں مل کے سب
وقت کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے
وقت سے ہیں ہمرکاب
کون جانے وقت سے بھی تیز ہوں
سب ہیں الجھے اک طلسمی جال میں
مست ہے ہر اک اپنے حال میں
خوب ہے ان کا طریق زندگی
بھول بیٹھے ہیں سبھی اقدار ہم
پھول پتوں کے مشینی شہر میں
رنگ و بو کا اک حسیں طوفان ہے
سخت مشکل میں مگر انسان ہے
کس لیئے آکر رکی ہوں اس پرائے شہر میں
کھینچ لایا ہے مجھے اک جذبۂ بے اختیار
ڈھونڈتی پھرتی ہوں مل جائے کہیں

پھر وہی ضربِ جنوں کربِ حسیں
توڑ ڈالے جو کہ زنجیروں کے حلقے
جبر کے قانون سب
اور پھر بدلے نظامِ زندگی

جی چاہتا ہے خود پہ مجھے اختیار ہو

جی چاہتا ہے دور تلک ہو حسین شام
بادل سا ہو وجود مرا آسمان پر
میں بھی ہوا کے دوش پہ ہر سو اڑا کروں
اور پر لگا کے سارا جہاں دیکھتی رہوں
ہلکی ہو اسقدر یہ مری روح مری جان
اس نیلے آسماں پہ مرا اختیار ہو
میرا وجود اس سے مجھ پر نہ بار ہو
چاہوں تو ساتھ رات کے تارے چنا کروں
چاہوں تو چاندنی کی حسیں ہر کرن کے ساتھ
میں بھی زمیں کے پانیوں پر عکس بن سکوں
میں اس کی موج موج میں خود کو بکھیر دوں

گہرے حسین ساگروں کے ساتھ بہہ سکوں
میں تہہ میں اس کی سیپیوں کے ساتھ رہ سکوں
جی چاہتا ہے خود پہ مجھے اختیار ہو
میرا وجود اس سمے مجھ پر نہ بار ہو
یہ سوچتی ہوں میں بھی کبھی کھل کے ہنس سکوں
میری ہنسی میں ساتھ مرے آسمان ہو
ہنستی ہوئی زمین ہو ہنستا جہان ہو
میں مسکراؤں گر تو فضائیں بھی ہنس پڑیں
گر آنکھ میری نم ہو تو پھر میرے ساتھ ساتھ
یہ آبشار جھرنے یہ بادل برس پڑیں
یہ تتلیاں یہ جھیل سمندر یہ کوہسار
خود اپنی وسعتوں میں مجھے بھی سمیٹ لیں
جی چاہتا ہے خود پہ مجھے اختیار ہو
میرا وجود اس سمے مجھ پر نہ بار ہو

شکستہ آئینے

بکھر گئی ہیں صورتیں
ہیں سب شکستہ آئینے
جو ہے پسِ خیال ہے
ہر آرزو نڈھال ہے
گریز پا ہوں میں ابھی
مجھے سکون چاہیئے
مجھے وہ چند سانس دے
کہ میں خود اپنے آپ سے
لپٹ کے رو سکوں ذرا
مرے نصیب میں ہی کیوں
لکھی گئیں مسافتیں

کہاں گئے وہ روز و شب
گئے دنوں کی ساعتیں
محبتیں رفاقتیں
ہے سوچ کیسی ہمسفر
نہیں ہے دل کو کچھ خبر
جنون فتنہ ساز ہے
اور آگہی سراب ہے
عجیب رنگِ خواب ہے
مجھے امان دے کہ اب
نہیں ہے مجھ میں حوصلہ
کسی بھی انقلاب کا
کسی نئے عذاب کا
کسی بھی اضطراب کا

دائروں کے درمیان بنتا شہر

دائروں کے درمیان بنتے ہوئے اک شہر میں
بے در و دیوار سے کچھ گھر نظر آئے تو ہیں
میری نظریں دور تک اس پھیلتے گرداب میں
دھندلے دھندلے کتنے منظر دیکھتی ہیں رات دن
کچھ ہیولے عکس کی صورت یہاں حرکت میں ہیں
ان کے ہاتھوں میں یہ کیا ہے؟
کوئی تیشہ ہے، قلم ہے یا کوئی تلوار ہے!
سب کے سب خود کاتبِ تقدیر بننے کے لئے
جُنبش میں ہیں
کیا وہ ضربِ تیشہ سے
یا کاٹ سے تلوار کی
اس فضا کو اس زمیں کو
اور اس شہرِ سکوں کی خامشی کو
توڑ دینے پر تلے بیٹھے ہیں آج

یا بے درو دیوار سے ساکت سے اس ماحول میں
بے چہرگی کا دکھ لئے چلتی ہوا پر
ایک جنبش سے قلم کی نقش کردیں گے
کوئی بھدا سا پیکر
یا کوئی تحریر ایسی
بوجھ جسکا آج یہ معصوم بستی
دائروں کے درمیاں کب سہہ سکے گی
اور اس چلتی ہوئی تلوار سے، تیشے سے
بے چہرہ ہوا کا جسم بھی کٹ جائیگا
دائرے بڑھتے رہیں گے
پھیل جائیں گے نشاں
اور پھر بننے سے پہلے ہی اجڑ جائے گی بستی
دائروں کے درمیاں

ندائے خیر

گردش ایام کی زنبیل میں
شاید کوئی لمحہ بچا ہو
جس پہ میرا نام لکھ رکھا ہو
میرے کاتب تقدیر نے
او پھر وہ ساعت خفتہ مجھے
بس ندائے خیر دے

لمعۂ پنہاں

گھیرے رکھتے ہیں مجھے واہمے آئندہ کے
ایک مدت سے ہوں خود اپنے تعاقب میں رواں
اور خود سے بھی بہت دور نکل آئی ہوں
جانے کیوں مجھ کو ہے نادیدہ وسیلوں کی تلاش
میرے اطراف مری خواہشیں آویزاں ہیں
حیرت آسا مری خاموش نگاہیں اکثر
ڈھونڈنے نکلی ہیں وہ لمعۂ پنہاں شہناز
بے صدائی کے کنویں سے جو نکالے مجھ کو
اور پھر قریۂ جاں کو مری روشن کر دے

تجھے پر کھولنا ہوں گے

فضائیں دُھند میں لپٹی ہوئی ہیں
تجھے پرواز کرنا ہے
تجھے پر کھولنا ہوں گے
تجھے در کھولنا ہوں گے
فضاؤں میں بکھرتی ریت
آنکھوں میں اتر جائے
ہواؤں کے بگولے بھی حصارِ راہ بن جائیں
فضامیں پھیلتی یہ دھند
تاروں کی کوئی ننھی کرن باہر نہ آنے دے
اُجالے بخشنے والا مسیحا کھو گیا ہو
تجھے پرواز کرنا ہے

تجھے پر تولنا ہوں گے
تجھے در کھولنا ہوں گے
تلاشِ جاں کے سب راہی
کبھی دم توڑتے تاروں کی کرنوں سے الجھتے ہیں
کبھی موجوں سے لڑتے ہیں
کبھی طوفاں میں بڑھتے ہیں
کبھی ٹوٹی ہوئی نیا سے بن پتوار دریا پار کرتے ہیں
شبِ تاریک میں سویا ہوا یہ چاند
آنکھیں موند کر سب دیکھتا ہے
اور یہ دھیرے سے کہتا ہے
نہ ہو سیماب پا جاناں
کہ یہ ظلمت کے رستے ہیں
مگر راہِ جنوں میں
تیرگی سے کون ڈرتا ہے
اندھیری رات میں شب زاد پیکر بھی
یونہی گرتے نہیں ہیں
کہ اک ٹوٹے ہوئے تارے کی اک دھیمی کرن
منزل کے رستے کھول دیتی ہے

تجھے پرواز کرنا ہے
تجھے پر تولنا ہوں گے
تجھے در کھولنا ہوں گے

سوال؟

ہمیں جانا کہاں ہے؟
کون جانے کون سے رستے پہ چلنا ہے
کہ ہر رستہ
تو اپنی رہ بدل لیتا ہے سنگِ میل سے پہلے
مری آنکھوں میں کتنی خواہشوں کے
آرزو کے
دیپ روشن ہیں
مگر یہ کیسا بوجھل پن مری جاں میں در آیا ہے
میں اکثر ادھ کھلی آنکھوں سے
اپنے ہمسفر کو دیکھتی ہوں
پوچھتی ہوں؟

ذرا تم ہی بتا دو؟
دریدہ ہاتھ' چھالے پاؤں کے کہتے ہیں کیا جاناں
کہیں منزل سے آگے تو نہیں ہم تم نکل آئے

زندہ رہنا تو اک روایت ہے

زندگی کا بھی فلسفہ ہے عجیب
کچھ کسی کو سمجھ نہیں آتا
سانس چلتی ہے زندہ رہتے ہیں
سانس لینا بھی ایک عادت ہے
زندہ رہتے ہیں زندگی کے لئے
زندہ رہنا بھی اک روایت ہے

حسرتوں کی قتل گہ

مری نگہ کا یہ سانحہ ہے
کہ سامنے میرے قتل گہ ہے
بہت سے بے ننگ و نام لاشے
یہاں پڑے ہیں
ہو کیسے پہچان
کونسی ہے ؟
مری تمنا کی لاش اس میں !!
نہ اس کو پورا جو کر سکی میں
کفن تو اسکو میں دے سکوں گی
مگر ہے خواہش اک اور جاناں
کہ اپنی ناکام حسرتوں کو
نہ یونہی چپ چاپ دفن کردوں
میں گیت لکھوں میں شعر لکھوں

جو بربطِ دل کے تار چھیڑے
وہ لفظ میں بار بار لکھوں
سکون ذوقِ جمال پائے
ملال میرا ذرا سا کم ہو
ہو قتل گہ میری حسرتوں کا مزار بے شک
مگر سسکتی سب آرزوئیں
یہ جان کر خوش تو ہو سکیں گی
سجا رہی ہوں مزار انکا
حسین پھولوں سے خوشبوؤں سے
محبتوں کے نقوش دے کر
اچھوتی سوچوں کے رنگ و بو سے

خواہش نادیدہ

تیری قربت میں محبت نے اماں مانگی ہے
کچھ سمے اور یونہی اور گزر جانے دے
کوئی بھی عکس ادھورا نہیں ہوتا جاناں
ایک ہلکی سی کرن ایک شُعاعِ امید
ان دھندلکوں میں کئی نقش بنا دیتی ہے
نیم خوابیدہ صداؤں سے چھلکتے الفاظ
زہر بن کر مرے سینے میں اتر جاتے ہیں
اور سرِ شام تمناؤں کے انبوہِ کثیر
کتنے ارمانوں کے بکھرے ہوئے لاشے لے کر
روح کے تار ہلانے کو چلے آتے ہیں
اے مری خواہشِ نادیدہ ذرا دیر ٹھہر

لفظ مرہم ہیں مری روح کے گھاؤ کے لئے
زخم گہرے ہیں ذرا ان کو تو بھر جانے دے
کچھ سمے اور یونہی گزر جانے دے
وقت کے دھارے کو کچھ دیر ٹھہر جانے دے

آنے والے کل کا خوف

کس لئے یہ فضا شکستہ ہے
کس نے زنجیرِ شب ہلا دی ہے
آخرِ شب مہیب سناٹا
آسماں کی طرف ہے محوِ سفر
آئینہ چاند کا مکدر ہے
اور تاروں کے بجھ گئے ہیں چراغ
کچھ زمیں پر بھی ابتری سی ہے
پھول سرگوشیوں میں کہتے ہیں
کوئی طوفان آنے والا ہے
کوئی سازش سی ہے خلاؤں میں
ایک پتھر فضا کے ہاتھ میں تھا
ایک پتھر فضا کے ہاتھ میں ہے

جینے کا حوصلہ دیدو

زندگی کے حسیں تسلسل میں
آج خود کو تلاش کرتی ہوں
وقت کا ایک قیمتی حصہ
گم کٹھالی میں کٹ گیا میرا
کیسے یکجا کروں وجود کو میں
تبکدہ دل کا ہو گیا ویراں
کس خدا کی میں آج بات کروں
زندگی کی حرارتوں کے لئے
کوئی پتھر کا دیوتا بھی نہیں
دل کے مندر میں گھنٹیاں باندھو
کعبۂ دل میں اب اذان بھی دو

کچھ کرو آج تم خدا کے لئے
مجھ کو جینے کا حوصلہ دے دو

الکھ نگری

نہ اب منزل کا کوئی واہمہ ہے
نہ اب احساس کے جنگل میں چنگاری سلگتی ہے
الکھ نگری ہے خواہش کی۔
دریدہ پاؤں ہیں۔
اور میں
مسافت کی ردا سر پر لپیٹے گھر سے نکلی ہوں
سفر ہے دور کا۔
اور راستے دھندلے ہیں سب جاناں
یہاں چٹیل پہاڑوں سے گرے پتھر پڑے ہیں
میں اپنی راہ سے کنکر چنوں پہلے۔
یا اپنے آبلوں سے۔

تشنہ لب ان پتھروں کی پیاس کو تھوڑا سا کم کر دوں
کبھی ایسا بھی ہو شاید۔
کسی پتھر کے دل سے ٹوٹ کر ایسی دعا نکلے۔
جو میرے جذب کو میرے جنوں کو۔
وحشتوں کی آگ سے بھڑکے الاؤ کو۔
نیا اک رنگ بخشے اور۔
دعاؤں کا حسیں منظر۔
مقدر کی ہر اک دشوار د ہ آسان کر جائے

زاویئے

کتنے زینے اندر میرے
بنتے اور بگڑتے ہیں
کچھ تعمیری کچھ تخریبی زاویے بنتے رہتے ہیں
ہم ہیں اپنی ذات کے قیدی
اپنی ذات کے کرب میں الجھے
گتھی کوئی بھی نہ سلجھے
سمے کا بندھن بڑھتا جائے
جیون ساگر گھٹتا جائے
سائے تو بس سائے ہیں
گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں
یہ دیواریں کچی سی ہیں

جب دیواریں کچی بھی ہوں
اور موسم میں شدت ہو
کچی دیواریں
کیا موسم کا کرب سمیٹے
بھیگی رت میں بھیگی شامیں
اڑتے بادل دیکھ سکیں گی
یا پھر سوندھی خوشبو بن کر
بھیگی شاموں کی پلکوں پر موتی دیں گی

فگار لہجہ

فگار ہاتھوں سے کیا لکھوں میں
یہی لکھوں کیا
حیات ساری
حیات کرنے کی آرزو میں گذار ڈالی؟
کسے بتاؤں
فرار چاہا تھا زندگی سے
ضرورتوں سے حسیں رتوں سے
بس ایک لمحے کی چاہ کی تھی
وہ ایک لمحہ تلاشنے میں
حیات ساری فگار گذری
فصیلِ جاں میں اسیر کرکے

مجھے تو محدود کردیا تھا
ہو گر اجازت تو پوچھنے کا
مجھے بھی اتنا تو حق ہے حاصل
مرے لئے گر نہیں تھا کچھ بھی
کوئی ستارا
کوئی کنارا
تو کیوں سجائی تھی بزم ساری
میں دشتِ امکاں کی تھی مسافر
تلاشنا تھا مجھے وہ جادہ
جو مجھ کو ہستی کے اس گُماں سے نکال پھینکے
سکون بخشے
سکون ایسا جو دائمی ہو
مرے لئے قریۂ یقیں ہو
طلسمِ جاں کے عذاب سہنے تھے گر یہاں پر
تو ایسی صورت نہیں تھی ممکن
کہ کوچۂ دائمی کے باسی
مقیم رہتے قریب تیرے
فگار ہاتھوں سے کیا لکھوں میں

فگار دل ہے فگار آنکھیں
فگار ہے کائنات ساری
فگار ہاتھوں سے کیا لکھوں میں

خموشی جان لیوا ہو گئی ہے

فضائیں اس قدر ساکت سی کیوں ہیں
کوئی نغمہ ہواؤں میں نہیں ہے
خموشی جان لیوا ہو گئی ہے
چلے آؤ کوئی طوفاں اٹھانے
کوئی آہٹ کوئی آواز تو ہو
گھٹا کے سنگ چمکیں بجلیاں بھی
پرندے ڈر کے آوازیں نکالیں
کوئی ہلچل ہو لمحے جاگ جائیں
فلک سے ٹوٹنے والے ستارے
خلاء میں رک کے پتھر ہو گئے ہیں
ترنم ہے نہ خوشبو پھیلتی ہے

ہر اک سو خامشی ہی خامشی ہے
سکوتِ بیکراں چھایا ہوا ہے
مری آواز پر کوئی تو پلٹے
مجھے مانوس لہجے میں پکارے
کئی صدیوں کا مجھ پر بوجھ سا ہے
سرِ مژگاں ستارے کانپتے ہیں
جھڑی لگ جائے ساون کھل کے برسے
زمیں پر آگ بڑھتی جا رہی ہے
یہ بوندیں آگ سی دھرتی پہ ٹپکیں
چھنا چھن کی مدھر آواز آئے
فضاء کی خامشی پھر ٹوٹ جائے
خموشی جان لیوا ہو گئی ہے۔

کہانی اپنی آگ کی

سوچ کی جھیل میں پھینک کے کنکر لہریں گنتی رہتی ہوں
آئینوں کو توڑ کے اکثر کرچیاں چنتی رہتی ہوں
کُنجِ وحشت سے میں نکل کر صحراؤں میں بھٹک جاتی ہوں
تپتی ریت پہ ننگے پاؤں چلتے چلتے تھک جاتی ہوں
دیواریں گریہ کرتی ہیں ساگر روتے رہتے ہیں
اور چپ سادھ کے سناٹے بھی لمبی تان کے سوتے ہیں
ایندھن بن کے جسم مرا بھی جلتا بجھتا رہتا ہے
آگ جلا کر اپنی روح کا دوزخ بھرتی رہتی ہوں
جل جائے گا تن من میرا راکھ مری رہ جائے گی
آخری چنگاری جو دبی ہے بات مری کہہ جائے گی

لمحۂ تخلیق

تخیل کی نئی پرواز ہوگی
فضا میں اک نئی آواز ہوگی
کوئی دہلیز پر آکر رکے گا

ادھار آنکھیں

وقت زنجیر سے بندھی سوچیں
کیوں نہ میں ان کو رھن رکھ دوں آج
اپنی آنکھیں کہیں چھپا آؤں
پھر کہیں سے ادھار لوں آنکھیں

آزاد قیدی

عجیب سی میری بے بسی ہے
میں ہو کے آزاد قید میں ہوں
مری تمنا کی دھجیاں تو بکھر چکی ہیں
کیوں میری سوچوں کے پنچھیوں پر
شکاریوں کی نظر لگی ہے
بصارتیں میری کھو گئی ہیں
سماعتوں پر لگا ہے پہرا
یہ بال و پر بھی بندھے ہیں میرے
بدلتے موسم کی کوئی خوشبو کوئی بھی آہٹ
مدھر فضا سے نہیں بلاتی
جو مجھ سے آزاد قیدیوں کو یقیں دلادے
کہ یہ ہوائیں یہ سب فضائیں
گلوں کی دلکش حسیں قبائیں
یہ رنگ و بو' یہ جمیل پیکر
ہماری خاطر وجود پہنے جہاں میں اترے
ہماری خاطر خلاء میں بکھرے ہیں چاند تارے
یہ کوہساروں کے سلسلوں کے جلال سارے بھی ہیں ہمارے

مگر ستاروں کا رت جگا اب
مری ہی پلکوں پہ آ رکا ہے
یہ گرتی شبنم کے نرم قطرے
مرے ہی گالوں پہ رک گئے ہیں
عجیب سی میری بے بسی ہے
میں ہو کے آزاد قید میں ہوں
بصارتیں میری کھو گئی ہیں
سماعتوں پر لگا ہے پہرا
یہ بال و پر بھی بندھے ہیں میرے
عجیب سی میری بے بسی ہے

آنچ سے پگھلتی برف

اک ردا دھند کی ابھرتی رہی
برف چاروں طرف بکھرتی رہی

اور بدلتی ہوئی یہ چنچل رت
جسم میں اک الاؤ بھرتی رہی

تھیں فضائیں بہت ہی یخ بستہ
آنچ سے اپنی میں پگھلتی رہی

سچ کے آنگن جھوٹ تماشا

دھوپ جو پہلی اتری تھی
نکھرے سچ کے آنگن میں
ڈرتے ڈرتے کومل سے
احساس نے جاکر پکڑی تھی
وہ اک جھوٹ کی گٹھری تھی
پھینک کے اس سچ آنگن میں
جھوٹ کے سارے پیر پجاری
چھپ گئے تھے دیوار کے پیچھے
جیسے بچے باندھ پٹاخہ
دیکھنا چاہیں ایک تماشہ
گٹھری سے اک شعلہ نکلا
بڑھتے بڑھتے آگ بنا وہ
تاب نہ اسکی لاتا کوئی
پاس نہ اسکے جاتا کوئی
کس میں جرائت آگے جائے
دوڑ کے بھڑکی آگ بجھائے
ایسا نہ ہو خود جل جائے
جھوٹ تماشا بڑھتا جائے

سچ کا آنگن جلتا جائے
نشتر جیسی کرنیں اسکی
سچ کے آئینوں پر پڑتیں
اسکی چبھن سے تیز جلن سے
سچ آنگن کے کومل پودے
خوشبو تتلی سندر غنچے
کھلتی کلیاں' بنتے سپنے
اک پل میں سب جھلس گئے تھے
سچ آنگن میں جھوٹ کے شعلے ناچ رہے تھے

بھنور

کسی طوفان کی زد میں ہے ازل سے یہ وجود
اور طوفاں ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے
ظلمتِ شب سے کبھی خوف جو محسوس ہوا
نوکِ مژگاں پہ ستارے بھی سجائے میں نے
خونِ دل سے بھی، کئی دیپ جلائے میں نے
اتنی بے مہر فضاؤں میں بکھیریں کلیاں
اپنے رنگین تخیل سے سجائی گلیاں
رتجگے کاٹ کے کچھ خواب اگائے میں نے
ڈوبتی شب کے اندھیروں کو مٹانے کے لئے
اپنے ارمانوں کے لاشے بھی جلائے میں نے
تلخئ دل تو کسی طور ذرا کم نہ ہوئی
گھاؤ بڑھتے ہی گئے آنکھ کوئی نم نہ ہوئی
روح کی راکھ پہ شعلوں سے شکن پڑتی رہی
میری آشفتہ سری بڑھتی رہی بڑھتی رہی
غم کی دہلیز پہ بیٹھے ہوئے صدیاں گزریں
کرب کے بوجھ تلے دبتی رہیں چلتی رہیں

اب تو لمحے بھی مرے پاؤں کی زنجیر ہوئے
آخری بار تقاضا ہے مرا یہ تجھ سے
جسم کی اندھی فصیلوں سے صدا دے مجھ کو
کوئی بھی عالمِ امکان دکھا دے مجھ کو
گردشِ وقت کے گرسارے بھنور میرے ہیں
چشم پوشی کا سلیقہ ہی سکھا دے مجھ کو

ریشم کی ڈور

اک تعلق کے لئے کیا کیا جتن میں نے کئے
ہاتھ کچھ آیا نہیں اور کچھ بھی بن پایا نہیں
ساتھ مل کے ہم نے تھامی تھی جو اک ریشم کی ڈور
وقت کے بے رحم طوفاں میں وہ ہم سے چھٹ گئی
ڈور تھی ریشم کی جو پھسلی پھسلتی ہی گئی
میں نے چاہا تھا پکڑ لوں دوڑ کر اس کا سرا
ہاتھ میرے کچھ نہ آیا فاصلہ بڑھتا گیا
اک سرا نزدیک تھا تیرے اگر تو چاہتا
بڑھ کے اس کو تھام بھی سکتا تھا مضبوطی سے تو
ناتواں ہاتھوں سے میرے چھٹ گئی ریشم کی ڈور

پھر بھی مدت تک مجھے یہ آس تھی کہ ایک دن
جو سرا نزدیک ہے تیرے پکڑ لائے گا تو
مجھ کو بتلائے گا جاناں یہ تو بندھن ڈور ہے
کچے دھاگے کی نہیں ریشم کا پکا جوڑ ہے
اک سرا بھی ہاتھ آجائے کبھی چھٹتا نہیں
اس سے جو باندھا ہے بندھن وہ کبھی کٹتا نہیں
بے کسی دیکھو نہ میری سوچتی میں رہ گئی
آنکھیں رکھ دہلیز پر میں آسماں تکتی رہی
تو نے کوشش ہی نہ کی کہ بڑھ کے اس کو تھام لے
اور باقی ڈور کو پھر کھینچ کر تو اپنے ساتھ
پاس میرے آئے اور مجھ کو ذرا سمجھا سکے
دیکھ لے آیا ہوں پھر تیرے لئے ریشم کی ڈور
کھل گئی ہے ڈور پر بندھن ابھی ٹوٹا نہیں
آؤں پھر بندھن پرانا مل کے اس سے باندھ لیں
سوچتی میں رہ گئی اور چھٹ گئی ریشم کی ڈور
دل کے آئینے سے کیسے کٹ گئی ریشم کی ڈور

اصلی چہرے پہ نیا چہرہ

جب بناتی ہوں تمناؤں کا مدفن کوئی
خوب ہنستی ہوں میں خود اپنی ہی بربادی پر
دن تو کٹ جاتا ہے ہر درد پہ ہنستے ہنستے
اصلی چہرے پہ نیا چہرہ سجا لیتی ہوں
خود کتنے ہی عذابوں سے بچا لیتی ہوں
ہنستے ہنستے جو ستارے سرِ مژگاں چمکے
گوشۂ چشم میں چپ چاپ چھپا لیتی ہوں
ضبطِ گریہ کا سلیقہ بھی یہاں سیکھا ہے
غم میں ہنسنے کا قرینہ بھی مجھے آ ہی گیا
گردشِ وقت کی ہر ایک حسیں ٹکر سے

آئنہ دل کا چٹختا ہے بکھر جاتا ہے
کوئی آواز مگر اس کی نہیں سن سکتا
کرچیاں دل کی فضاؤں میں بکھر جاتی ہیں
سسکیاں میری ترنم میں بدل جاتی ہیں
دن کے میلے سے نکل کر شبِ تنہائی میں
کتنا دشوار ہے یوں خود کو سنبھالے رکھنا
سوچتی ہوں کہ وہی میں ہوں وہی دنیا ہے
ہے سبھی کچھ تو وہی دن کے اجالوں کے سوا
خول جو صبح تھا چپکے سے ہٹا دیتی ہوں
اصلی چہرہ نئے چہرے پہ لگا لیتی ہوں
دکھ کے سائے جو نظر آتے ہیں اب آنکھوں میں
ایک خنجر سا مرے دل میں اتر جاتا ہے
چند گھڑیاں جو مجھے ملتی ہیں تنہائی کی
وہی لمحے تو مرے صرف مرے اپنے ہیں
چشمِ گریہ کو اجازت ہے برس جانے کی
چیخ جو گھُٹ سی گئی صبح کی پہنائی میں
رات کے پچھلے پہر لب پہ مرے آتی ہے

اپنے دکھ خود سے ذرا دیر میں کہہ لیتی ہوں
دو گھڑی ساتھ میں اپنے ذرا رہ لیتی ہوں
بوجھ ہلکا شبِ تنہائی میں ہو جاتا ہے
تازہ دم ہو کے اجالوں میں نکل آتی ہوں
ہنستے ہنستے میں ہر اک زہر نگل جاتی ہوں
اصلی چہرے پہ نیا چہرہ سجا لیتی ہوں
خود کو کتنے ہی عذابوں سے بچا لیتی ہوں

بے وقت گداگر

تاپتے دھوپ الاؤ مجھے صدیاں گزریں
جلتا سورج ہی مقدر میں لکھا کیوں میرے
کیا ترے پاس یہی کچھ تھا بتا میرے لئے
ساری ٹھنڈک کو بہاروں کو کہیں بانٹ دیا
مجھ سی بے وقت گداگر کے لئے کچھ نہ بچا
جذبوں کی آنچ کی حدت سے پگھلتی ہی رہی
تیز شعلوں سے شبِ تار میں جلتی ہی رہی
اور جب کاسہ لئے در پہ ترے میں پہنچی
مجھ کو کچھ بھی نہ ملا میرے مسیحا نے کہا
تجھ سی بے وقت گداگر کے لئے کیا رکھتے!

روشنی بانٹ رہے تھے تو کہاں پر تھی تو
کیسے کہتی کہ مجھے کارِ گراں بخشا تھا
وہ ہی نمٹاتے ہوئے وقت مرا گزرا ہے
جب جلن حد سے بڑھی سہہ نہ سکی میں یہ تپش
در پہ تیرے اے مسیحا میں چلی آئی ہوں
میں سمجھتی تھی کہ میں جب بھی سوالی بن کر
خالی کاسے کو اٹھا کر ہی چلی آؤں گی
جانے کشکول میں کیا کیا مجھے بھر کر دے گا
تو بھی کہتا ہے کہاں وقت گنوایا میں نے
تجھ سے چاہت کا صلہ اچھا یہ پایا میں نے
ہاں یہ ہے ٹھیک کہ سب بانٹ دیا ہے تو نے
چاند گر میرے نصیبوں میں نہیں تھا کوئی
اک کرن نور کی بس نام مرے لکھ دیتا
مجھ سی بے وقت گداگر کو وہی کافی تھی
کاسۂ چشم میں موتی کے خزانے بھر کے
کاسۂ دل لئے خالی میں پلٹ آئی ہوں
تاپنے دھوپ الاؤ میں چلی آئی ہوں

جلتے سورج کے تلے یونہی مجھے جلنا تھا
مجھ سی بے وقت گداگر کو یہی ملنا تھا

پچھتاوا

مجھ کو پانا تیری خواہش تھی مری خواہش نہ تھی
میں نے تو بس تیری خواہش کا کیا تھا احترام
قیمتی کتنے ہی لمحے حادثوں میں بٹ گئے
اور پھر منزل سے پہلے راستے بھی کٹ گئے
آج کہتا ہے تعلق تجھ سے کچھ میرا نہیں
بات یہ تیری نہیں ہے یہ ترا چہرہ نہیں
ناطہ مجھ سے توڑ کر تو نے بہت اچھا کیا
پھیر لیں نظریں بھی مجھ سے یہ بہت اچھا کیا
منتظر آنکھوں سے اب میں چھین لوں گی سارے خواب
اشک میں کیسے سمیٹوں ہو گئی ہوں لاجواب

بھولنے والے سے کہہ دو یاد بھی آئے نہ اب
اور تخیل میں کبھی صورت بھی دکھلائے نہ اب
میں اکیلی ٹھیک ہوں زخموں سے کرلوں گی حساب
منتشر اس ذہن کو دے لوں گی میں خود ہی جواب
ہاتھ جھٹکا تو نے میری بے رخی بھی دیکھنا
چین تجھ کو مل سکے گا کس طرح سے عمر بھر
جس طرح تڑپی ہوں میں تڑپے گا تو بھی عمر بھر
ہر طرف بکھری ہے میرے ٹوٹے دل کی کرچیاں
دل میں ترے بن کے یہ نشتر اتر جائیں گی جب
تجھ سے پھر برداشت کب ہو پائے گی ان کی چبھن
راستے سے کرچیاں چن کر مرے گھر آئے گا
اور پھر بے سود ہو گا لوٹ کر آنا تیرا
کچھ نہ مل پائے گا تجھ کو خالی واپس جائے گا
اور پچھتاوا تجھے ساری عمر تڑپائے گا

چاپ

دھیرے دھیرے بڑھتا سناٹا مجھے ڈستا رہا
سایہ بھی گم ہوگیا لیکن سفر کٹتا رہا
اک کرن کی آس پر ظلمتِ شب غم کی سہی
چاپ اک امید کی لیکن کبھی نہ سن سکی
گریہ زاری بھی مداوا درد کا کب کر سکی
وقت کے مرہم سے کوئی گھاؤ بھی کب بھر سکی
تھی سماعت منتظر امید کی اک چاپ کی
دھند کے اس پار سوچا تھا نظر کچھ آئے گا
مجھ کو جینے کا کوئی رستہ کبھی مل جائے گا
وقت کی گردش تو دیکھو وقت چلتا ہی رہا

اور تپش سے درد کی یہ دل مرا جلتا رہا
تھی سماعت منتظر امید کی اس چاپ کی
شب کے سناٹے میں مجھ کو آ کے جو بتلا سکے
تیری قسمت کی سیاہی ختم ہونے کو ہے اب
صبح کے سارے اجالے بن کے اب تقدیرِ نو
وقت کے بخشے ہوئے ہر زخم کو بھر جائیں گے
گوش بر آواز ہوں اک چاپ سننے کے لئے
ظلمتِ شب بڑھ گئی آواز کوئی بھی نہیں
آ بھی جا چپ چاپ سے جاگی ہوں میں سوئی نہیں

ڈھند کے بعد

اترتی زرد سیہ شب میں دھند کے بادل
ہوا کے دوش پہ لہراتے آ کے ٹکراتے
مرے مکاں کے دریچوں کے بند شیشوں سے
دھواں دھواں سا بکھر جاتا میری آنکھوں میں
نگہ سے دور کے منظر تمام چھپ جاتے
سکوت توڑنے یخ بستہ ان فضاؤں کا
ہوائیں دھند سے سرگوشیاں سی کرتی تھیں
قریب آ کے بھی اک دوسرے سے ڈرتی تھیں
یہ کیا ہوا کہ یونہی باہمی تکلم سے
ردا جو دھند کی بکھری ہوئی تھی چاروں طرف

پگھل کے درد سے نمناک ہو گئی جاناں
کراہ تو نہ سنی اس کی برف موسم میں
کسی بھی پھول نے جگنو نے اور خشبو نے
مگر درختوں دریچوں پہ جو دھواں سا تھا
وہ ایک آہ سے پگھلا تھا چشم تر کی طرح
شجر تمام ہی چپ چاپ رو رہے تھے وہاں

تھا برف برف سا موسم تپش دلوں میں تھی
بڑھی تھی رنجشیں اتری خلش دلوں میں تھی
مری نگاہ دریچوں پہ جم گئی اس شب
پھر اک عجیب سا منظر مری نگاہ میں تھا
دھواں دھواں سی فضا میں ہوا تھی نوحہ کناں
تمام شہر شبِ گریہ کی پناہ میں تھا

عکسِ تمنا

نکل بھی جاؤں اگر وادیٔ تعلق سے
گریز رستوں سے ہو گا مجھے گوارا کب
خود اپنی ذات کی تردید کس طرح ہو گی
کروں گی ترکِ تعلق کا کیا بہانہ میں
مرے خلاف گواہی کے واسطے شاید
مری خود اپنی تمنا ہی آ کھڑی ہو گی
چراغِ چشمِ گریزاں میں جل رہے ہوں گے
ہر ایک زخم دکھانے کو ساتھ لائے گی
شکستہ دل کی سبھی کرچیوں کو چن چن کر
مثالِ آئینہ ہر عکس وہ دکھائے گی

خود اپنے عکسِ تمنا کو دیکھ کر شاید
گریز پا میں کسی نقش سے بھی ہو نہ سکوں
نکال خود کو کسی وادیٔ تعلق سے
جو داغ مجھ کو ملے وہ کبھی بھی دھو نہ سکوں

اسم محمدؐ

ذہن دریچے کھول کے بیٹھی
ہاتھ پہ رکھے ہاتھ
کیسے لکھوں نعت
بھیگا چہرہ بھیگی پلکیں
بھیگ رہی ہے رات
چشمِ بینا نورِ بصیرت
کوئی نہ دیگا ساتھ
اسمِ محمدؐ دل پہ جو اترے
پھر ہی بنے گی بات

○

تھے عجیب میرے بھی فیصلے میں کڑی کماں سے گزر گئی
رہے فاصلے مرے منتظر میں تو جسم و جاں سے گذر گئی

جو بھی قرض تھا مری جان پر وہ یہیں پہ میں نے چکا دیا
رہی فکر مجھ کو نہ سود کی تو ہر اک زیاں سے گذر گئی

مجھے راستوں کی خبر نہ تھی اڑی خاک میرے وجود کی
میں تلاش کرتی ہوئی تجھے ترے لامکاں سے گذر گئی

تھیں طویل اتنی مسافتیں کوئی ساتھ میرا نہ دے سکا
وہ یقیں کی حد پہ ٹھہر گیا میں ہراک گماں سے گذر گئی

مرا شوق تھا مرا ہم سفر، تھی بلندیوں پہ مری نظر
نہ زمیں کی قید میں رہ سکی ہر اک آسماں سے گذر گئی

وہ سیاہ شب تھی فراق کی کئی دیپ آنکھوں میں جل بجھے
مجھے جگنوؤں نے نوید دی کہ تو امتحاں سے گذر گئی

تو حجاب میں، میں سراب میں، مری زندگی ہے عذاب میں
تجھے اپنا کہنے کی چاہ میں کڑے امتحاں سے گذر گئی

کہیں پھول تھے کہیں تتلیاں، کہیں زخم تھے کہیں بجلیاں
میں خمار میں تھی بہار کے میں ہر اک خزاں سے گذر گئی

نہ عیاں ہوا نہ نہاں ہوا، ہوا امتحاں مرے جذب کا
مجھے مل سکا نہ کوئی نشاں میں کہاں کہاں سے گذر گئی

رُخِ آسماں پہ جو داغ تھے سبھی ظلمتوں نے چھپا لیئے
میں چراغِ شام نہ بن سکی شبِ راز داں سے گذر گئی

جو خلش سی تھی وہ عزیز تھی مجھے چارہ گر نہ ملا تو کیا
میں بھی دشمنوں کی پناہ میں کوئے دوستاں سے گذر گئی

مری ہر صدا ہوئی نارسا تو قصور کس کا ہے تو بتا
مری آرزو مری ہر دعا تو لبِ فغُاں سے گذر گئی

○

اسیرِ ذات رہے اعتراف کیسے ہو
خود اپنے آپ سے کچھ انحراف کیسے ہو

محال ہے کہ گماں سے یقین تک پہنچیں
سرِ دیارِ عدم اعتکاف کیسے ہو

فصیلِ شہر کو خود اپنے ہاتھ سے توڑا
نقیب وقت سے اب اختلاف کیسے ہو

شکستہ آئینہ خانوں میں عکس کس کے ہیں
یہ راز کیسے کھلے انکشاف کیسے ہو

تمام عمر گریزاں رہے زمانے سے
یہ جرم اپنی انا کا معاف کیسے ہو

نشاں دراڑ کا شہؔناز مٹ نہیں سکتا
جو بال بال ہو شیشہ وہ صاف کیسے ہو

تلخیٔ دوراں سے تو شہناز گھبراتے نہیں
اپنے اندر کتنے صحرا ہیں نظر آتے نہیں

منزلوں کی جستجو میں ڈھونڈتے ہو کیا چراغ
راہ میں کیوں جگنوؤں کے گھر نظر آتے نہیں

جو بکھرنا ہو تو موجوں میں بنا لیتے ہیں گھر
آبگینے ٹوٹ کر ساحل سے ٹکراتے نہیں

جادۂ عرفاں پہ جا کر روشنی سے پوچھنا
تتلیوں کے پر فضا میں کیوں نظر آتے نہیں

خواہشِ بے نام پر کٹواؤ مت دستِ ہنر
بے سبب آپس میں دو پتھر تو ٹکراتے نہیں

○

کربِ تنہائی بتا تجھ کو چھپاؤں کیسے
لوٹ کر جانا بھی چاہوں تو میں جاؤں کیسے

آگ بڑھتی ہی گئی کوئی بجھانے نہ اٹھا
کسی دریا کو نشاں اپنا بتاؤں کیسے

نوکِ مژگاں سے چُنوں بکھرے ہوئے رنگ سبھی
ریت ساحل پہ جو بکھری ہے اٹھاؤں کیسے

پیرہن چاک ہوا گُل کا تو رو دی شبنم
سبز موسم کو بھلا ڈھونڈ کے لاؤں کیسے

کون سی سمت لئے جاتا ہے طوفاں مجھ کو
ڈھونڈنے والے کہاں ہوں میں بتاؤں کیسے

گیلی مٹی پہ نشاں قدموں کے چھوڑے شہناز
بہتے پانی پہ نیا نقش بناؤں کیسے

○

کوئی خوشبو کوئی جھونکا سفر کا استعارا ہو
مجھے بھی کوئے جاناں سے کوئی تو اب اشارا ہو

فضائیں مرتعش سی ہیں سکوتِ شام ٹوٹا ہے
مرے روٹھے خدا نے پھر مجھے شاید پکارا ہو

نشاں اپنا مٹا دیتی ہیں کتنی تند خو موجیں
کہ جب بھی ڈوبنے والا سمندر کا کنارا ہو

روابط بھی علامت زندگی کی بنتے جاتے ہیں
ضرورت ہو مری یا واسطہ کوئی تمہارا ہو

آنا اضداد کے گرداب میں گھرتی ہی جاتی ہے
خدایا اس سمندر کا کوئی آخر کنارا ہو

مُسافت کی تھکن اس لوٹنے والے سے مت پوچھو
جسے ساحل دکھا کر پھر سمندر میں اتارا ہو

مخالف سمت منزل ڈھونڈنا عادت رہی اپنی
ہوا کے دوش پر شہناز کا کیسے گذارا ہو

○

زرد رُت کا فضا پہ پہرا ہے
موسمِ گُل کہاں پہ ٹھہرا ہے

میں ازل سے ہوں تشنہ لب لیکن
ساتھ اس کے بھی ایک صحرا ہے

رابطہ استوار کیسے ہو
خواہشوں پر انا کا پہرا ہے

مجھ سے رستوں نے منزلیں چھینیں
ہر نشاں سنگِ میل ٹھہرا ہے

منزلوں پر چراغ کیا جلتے
راستوں پر ہوا کا پہرا ہے

سبز رُت میں گلاب جھلسے ہیں
بیتے موسم کا زخم گہرا ہے

کیا ہواؤں سے ہو گلہ شہناز
تیرے اندر الاؤ ٹھہرا ہے

○

سرمئی شام ہے سناٹا ہے تنہائی ہے
کیسی بے چینی مری روح میں در آئی ہے

ایک محشر ہے بپا سوچ کے ویرانے میں
شورشِ دل مرے ہونٹوں پہ اتر آئی ہے

دل کا سناٹا مری روح میں اترا جاناں
ضبطِ گریہ سے مری جان پہ بن آئی ہے

گھیرے رکھتا ہے مجھے کربِ مسلسل کا حصار
غمِ دوراں غمِ جاناں سے شناسائی ہے

خالی کشکول تھا پھر بھی نہ بڑھا دستِ سوال
تو نے جانا ترا سائل کوئی سودائی ہے

اُف یہ نیرنگئ دوراں یہ تمنا کے سراب
دشتِ حیرت میں بھٹکنے کی سزا پائی ہے

شیشۂ دل تو چٹختا ہی رہا ہے شہنازؔ
بھرتے پیمانے چھلک جانے میں رسوائی ہے

○

اب کڑی دھوپ میں تنہا ہی نکلنا ہو گا
اور تنہائی کا دکھ ساتھ ہی رکھنا ہو گا

گھاؤ کس کس سے ملے ہیں نہ کوئی جان سکے
اب مجھے اپنی نگاہوں سے بھی چھپنا ہو گا

نہ کوئی ساتھ تمناؤں کے مصلوب ہوا
لاد کر شانوں پہ لاش اپنی نکلنا ہو گا

راکھ ہو جائے گی ہر ایک تمنا لیکن
کتنی دیر اور ابھی آگ میں جلنا ہوگا

خود کلامی بھی ہے ہر زخم کا مرہم شہنازؔ
شدتِ درد کو کم خود تجھے کرنا ہوگا

○

بہت محال ہے خود سے تجھے جدا کرنا
بس ایک وعدہ کبھی آ کے مل لیا کرنا

حسین رتجگے کرنے کو خواب چُن چُن کر
حسین لمحوں کی تعبیر لکھ لیا کرنا

بدلتی رت میں پریشاں کرے جو سناٹا
فضا میں کوئی پرندہ اڑا دیا کرنا

گماں یہ گذرے کہ سایہ بھی ساتھ چھوڑ گیا
ہوا کے ہاتھ پہ پیغام لکھ دیا کرنا

سیاہ شب میں ڈسے جب بھی کربِ تنہائی
چراغ یاد کے دل میں جلا لیا کرنا

جب آبشارِ تصور خموش ہو شہناز
تو جھیل میں کوئی کنکر گرا دیا کرنا

○

کوئی لمحہ اگر بچا ہوگا
دامنِ وقت پر سجا ہوگا

مجھ کو عادت نہیں ہے دستک کی
خود کوئی در کھلا تو کیا ہوگا

کتنا گہرا تھا زخم چھوڑو بات
زخم تھا زخم بھر گیا ہوگا

جیتی بازی بھی ہار جائیں گے
مدتوں تک یہ سلسلہ ہوگا

منتظر آنکھ ہے مسیحا کی
طور تو کب کا جل گیا ہوگا

آتشِ شوق کو بھڑکنے دے
چشمِ پُرنم ترا بھلا ہوگا

اے غمِ دھر سانس لینے دے
ختم کب تیرا سلسلہ ہوگا

ان فصیلوں کو توڑ دے شہناز
کارواں وقت کا رکا ہوگا

○

غم مجھ سے کسی طور سمیٹا نہیں جاتا
پہرا ہے مری سوچ پہ بولا نہیں جاتا

اب دل کے دھڑکنے کی صدا بھی نہیں آئی
اور قریۂ خواہش سے بھی نکلا نہیں جاتا

سجدے کے نشانوں سے جبیں زخم ہوئی ہے
اور تجھ سے مقدر مرا بدلا نہیں جاتا

سورج کے نکلنے کی خبر مجھ کو بھی کرنا
ظلمت کدۂ شب میں تو ٹھہرا نہیں جاتا

آنکھوں میں چھپے خواب بھی چھن جائیں نہ مجھ سے
اس خوف سے روزن کوئی کھولا نہیں جاتا

ہر روز نشیمن پہ مرے گرتی ہے بجلی
گھر مجھ سے نیا روز بنایا نہیں جاتا

ہم اپنی اناؤں کا بھرم رکھتے ہیں شہناز
ہر بات پہ طوفان اٹھایا نہیں جاتا

○

کچھ نہیں بدلا مگر حالات ہی کچھ اور ہیں
زیست کرنے کو مرے جذبات ہی کچھ اور ہیں

وحشتوں کے دشت میں اوڑھی تھی چادر دھوپ کی
گھِر تو آئی ہے گھٹا خدشات ہی کچھ اور ہیں

روشنی کی بھیک کیوں مانگوں کسی سے آج میں
رقص ہے شعلوں کا پر شبہات ہی کچھ اور ہیں

آنکھ کھلتی بھی نہیں اور آنکھ لگتی بھی نہیں
ضبطِ گریہ ہے مگر صدمات ہی کچھ اور ہیں

روح کو شہناز کیسے دوں نئی بیساکھیاں
منجمد ہے سوچ' احساسات ہی کچھ اور ہیں

○

مرا قرار مرا اضطراب لے جائے
کہو اسے مرے سارے عذاب لے جائے

تمازتوں سے سلگنے لگا ہے میرا وجود
دھواں دھواں ہوں مجھے وہ سحاب لے جائے

میں منتظر ہوں مرے کاسۂ نظر کے سمیت
وہ زندگی کی ادھوری کتاب لے جائے

ذرا سی دیر مجھے بھی سکوں ملے شاید
وہ مجھ سے میرا پرانا حساب لے جائے

بھلا کے ترکِ تعلق وہ آئے اور شہناز
محبتوں کا ہر اک انتساب لے جائے

○

یہی رُت ہے بچھڑنے کی نہ جانے کب بکھر جائیں
ہر اک گذری ہوئی ساعت کو تیرے نام کر جائیں

یہ تیرے ساتھ لفظوں نے بھی کیوں چپ سادھ لی جاناں
ادھر آ لفظ کی دہلیز سے مل کر گذر جائیں

فصیلِ وحشتِ شب کی درازی زہرِ قاتل ہے
جنوں کی ان حدوں کو پھاند کر آخر کدھر جائیں

مُسافت کی تھکن ہے ضبطِ گریہ جان لیوا ہے
چھپائے آنکھ میں آنسو نہ ہم جاں سے گذر جائیں

○

اتنا احساسِ ندامت نہ دلایا جائے
فیصلہ جرم کا اک بار سنایا جائے

موسمِ جبر ہے لفظوں کی مسیحائی سے
ایک پتھر کو بھی آئینہ بنایا جائے

میرا ہر خواب ادھورا کوئی تعبیر نہیں
عکس کیسا سرِ دیوار سجایا جائے

بعد مدت کے چراغاں سا مرے دل میں ہوا
کوچۂ شہرِ تمنا کو سجایا جائے

ناشناسی کے کئی زاویے بنتے دیکھے
ہم نوا کس کو زمانے میں بنایا جائے

ہے ابھی پیشِ نظر کوئی سہانا سپنا
آتشِ دل کو ابھی اور بچایا جائے

نقشِ خاموش ہوں حیراں ہے زمانہ شہناز
محوِ حیرت کو تماشا نہ بنایا جائے

○

آتشِ شوق بجھ گئی شعلۂ دل جلا ہے آج
میں نے ترے فراق کا چولا پہن لیا ہے آج

روزنِ شب سے جھانکتے سارے چراغ ماند ہیں
مجھ کو ہوا کے ظلم سے کوئی نہیں گلہ ہے آج

ظلمتِ شب سے کہہ ذرا اپنی ردا سمیٹ لے
دل کا دیا تو شام سے میں نے بجھا دیا ہے آج

بکھرے ہوئے ہیں چار سو تیری ہی یاد کے گلاب
کوئی نہیں سمیٹتا کیسا یہ سلسلہ ہے آج

سہمی ہوئی ہے چاندنی کیسے کہوں میں دل کی بات
روٹھی ہوئی بہار ہے روٹھا ہوا خدا ہے آج

کوئی منظر کوئی تصویر نہیں بنتی ہے
مجھ سے خود اپنی ہی تقدیر نہیں بنتی ہے

دشتِ حیراں میں بہت دور نکل آئی ہوں
اب پلٹ جانے کی تدبیر نہیں بنتی ہے

جاگتی آنکھوں میں اک شہرِ تمنا آباد
اور کسی خواب کی تعبیر نہیں بنتی ہے

کون سے موڑ پہ تنہا مجھے کر ڈالا تھا
مجھ سے اب فکر کی زنجیر نہیں بنتی ہے

دل دریدہ کی ہے ہر سوچ ادھوری شہناز
لفظ خاموش ہیں تحریر نہیں بنتی ہے

○

گردشِ دو جہاں میں رہتی ہوں
ہر گھڑی امتحاں میں رہتی ہوں

ساتھ ہے اک جہاں تخیل کا
لفظ بن کر زباں میں رہتی ہوں

کیسے طوفاں نے گھیر رکھا ہے
خوف کے کس مکاں میں رہتی ہوں

آخری حد کہیں یقیں کی نہیں
اس لئے میں گماں میں رہتی ہوں

خود کو پانا نہیں ہے ناممکن
منزلوں کے نشاں میں رہتی ہوں

اب بھنور کا نہیں ہے ڈر شہناز
دائروں کے جہاں میں رہتی ہوں

○

ڈھونڈنے نکلی تھی میں درد کا درماں جاناں
راستہ پایا ہر اک شعلہ بداماں جاناں

عمر گذری ہے مری عرصۂ تنہائی میں
اور سہ سکتی نہیں وحشتِ زنداں جاناں

یوں ترے مل کے اچانک ہی بچھڑ جانے پر
آج تک بیٹھی ہوں انگشت بدنداں جاناں

مرحلے طے نہ ہوئے تیری محبت کے مگر
کب سلے مجھ سے مرے چاکِ گریباں جاناں

چاندنی زرد ہے وحشت ہے فضا میں شہناز
کون ٹھہرے گا یہاں شہر ہے ویراں جاناں

○

میں خود سے کیا کیا فرار چاہوں
سکون مانگوں قرار چاہوں

سمٹنا چاہوں حصارِ جاں میں
سمٹ نہ پاؤں ہزار چاہوں

جو زخم دل پر لگا گئیں ہیں
میں ان رُتوں کا شمار چاہوں

عجیب الجھن میں مبتلا ہوں
نہ جیت مانگوں نہ ہار چاہوں

مجھے بھی کچا گھڑا ملا ہے
اترنا دریا کے پار چاہوں

بہت سے سپنے ہیں نامکمل
میں رتجگوں سے فرار چاہوں

نہ ہو کے محدود رہ سکوں گی
میں وسعتِ بے کنار چاہوں

○

ساتھی سارے چھوڑ گئے ہیں بیگانوں میں کھو جاؤ
دیوانوں کی بھیڑ لگی ہے دیوانوں میں کھو جاؤ

شمع کے سنگ موم ہوئے تو قطرہ قطرہ بہہ جاؤ گے
اپنی آگ میں جلنے والو پروانوں میں کھو جاؤ

دام بچھائے کُنجِ قفس میں بیٹھے ہیں صیاد یہاں
زنجیریں حلقہ بنتی ہیں زندانوں میں کھو جاؤ

دھوپ میں نکلو گے تو جاناں پر سارے جل جائیں گے
اپنی اپنی سوچ کے بنتے پیمانوں میں کھو جاؤ

انسانوں کی اس دنیا میں جذبے سارے جھوٹے ہیں
تلخ حقائق بھول کے سارے افسانوں میں کھو جاؤ

دکھ کی آگ جو پھیل گئی تو جسم و جاں جل جائیں گے
کرب کے گہرے ساگر لے کر طوفانوں میں کھو جاؤ

بازاروں چوراہوں میں اک بھیڑ لگی ہے لوگوں کی
ہوش و خرد سے بیگانے ان انسانوں میں کھو جاؤ

بستی میں دریا کے کنارے عمر گذاری ہے شہناز
الجھو مت موجوں سے اب تم طوفانوں میں کھو جاؤ

○

آئنہ اب مجھے دکھا بھی دے
خود کو مجھ سے ذرا ملا بھی دے

اضطرابِ جنوں فزوں تر ہے
ذوقِ پرواز کچھ بڑھا بھی دے

سطحِ دریا پہ بن رہے ہیں بھنور
کوئی طوفان اب اٹھا بھی دے

گھر کے آنگن میں اترے کوئی کرن
سرِ مژگاں دیئے جلا بھی دے

جستجو کے ہیں دائرے اور میں
جگنوؤں کو مرا پتا بھی دے

نیم خوابیدہ خواہشیں ہیں ابھی
آفتاب آ مجھے جگا بھی دے

سبز موسم تلاشنے کے لئے
سوکھے پتّوں کو اب ہوا بھی دے

میں جزیرے میں نیند کے اتروں
خواب آنکھوں میں اب بسا بھی دے

کم عذابِ فراق ہو جائے
صبح کو شام سے ملا بھی دے

○

رُخِ امکاں بدلتی جا رہی ہوں
یہ کس سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہوں

مسافر دشتِ حیرت کی ہوں لیکن
مقدر سے میں تھکتی جا رہی ہوں

مری آنکھیں سمندر ہو گئی ہیں
میں سورج بن کے جلتی جا رہی ہوں

سجا کر دشتِ خواہش سوچتی ہوں
میں کیوں خود میں سمٹتی جا رہی ہوں

سبھی موسم ہیں تیرے میرا کیا ہے
تو پتھر میں پگھلتی جا رہی ہوں

بگولے ساتھ ہیں شہناز ہر دم
غبارِ راہ بنتی جا رہی ہوں

○

چند گھڑیاں نہیں گذری تھیں شناسائی کو
شُعلہ اندام چلے آئے پذیرائی کو

کون جانے وہ حسیں تھا کہ تمنا میری
ڈھونڈ لائی تھی کہیں سے مری رسوائی کو

عکس ٹھہرا تھا مرے دیدۂ تر میں کب سے
آئینہ ڈھونڈ نہ پایا رُخِ زیبائی کو

ٹوٹ کر ریزہ ہوئے جاتے ہیں سب خواب مرے
کہہ دو گریہ نہ کرے چشمِ تماشائی کو

باد و باراں بھی نہیں بام نہیں در بھی نہیں
کوئی چھینو نہ مرے گوشۂ تنہائی کو

اپنے احساس پہ کھینچو نہ لکیریں شہناز
توڑ ڈالو بھی بُتِ رہزنِ بینائی کو

○

بدلنے کو لہجہ زباں ڈھونڈتی ہوں
میں لفظوں میں کُنجِ اماں ڈھونڈتی ہوں

مری روح کے گھاؤ مرہم طلب ہیں
رفو گر ہوں زخمِ نہاں ڈھونڈتی ہوں

جہاں سنگ ریزے ہیں ہاتھوں میں سب کے
وہیں کانچ کا میں مکاں ڈھونڈتی ہوں

میں اب کاسۂ دل میں ارماں سجا کر
بدلتی رتوں کا سماں ڈھونڈتی ہوں

وہ اک نقشِ پا جو مقدر ہو میرا
میں سجدوں میں اس کے نشاں ڈھونڈتی ہوں

○

اوج پر کچھ مرا مقدر ہے
شاخِ اُلفت بھی کچھ ثمرور ہے

دل میں آباد ہے صنم خانہ
سرپرست اپنا کوئی آذر ہے

گر نہ صیقل کرے اسے کوئی
آئینہ بھی تو ایک پتھر ہے

کب تلاشے ہیں میں نے سنگِ میل
چلتے رہنا مرا مقدر ہے

میرے دل سے دعا نکلتی ہے
جانتی ہوں کہ وہ ستمگر ہے

مری طرح سے کہیں خاک چھانتا ہوگا
وہ اپنی ذات کے صحرا میں کھو گیا ہوگا

شرار راکھ میں باقی رہا نہیں کوئی
چراغ دل کا مرے جل کے بجھ گیا ہوگا

پلٹ کے در پہ مرے بار بار آتا ہے
ہجومِ شوق نے محشر بپا کیا ہوگا

جو میری جھیل سی آنکھوں میں ڈوب ڈوب گیا
ستارہ وار کہیں خود کو ڈھونڈتا ہوگا

پھر آج قریۂ جاں پر عذاب اترے ہیں
کسی نے پھر نیا ترکش سجا لیا ہوگا

چھلکتے جاتے ہیں منظر تمام آنکھوں سے
دریچہ یاد کا شاید اٹھ کھلا ہوگا

سماعتوں پہ مری آج کیسی دستک ہے
کوئی ہوا سے پتا میرا پوچھتا ہوگا

وہ شخص میرا شناسا نہیں تو کون ہے وہ
کسی کو ڈھونڈتا رستہ بھٹک گیا ہوگا

نفس نفس میں کوئی آشکار ہوتا ہے
جو میرے دل کے قریں ہے مرا خدا ہوگا

تری تلاش میں وہ منتشر ہوا ایسا
سراغ اپنا بھی اس کو نہ مل سکا ہوگا

بدلتی رت میں وہ کیسا بدل گیا شہناز
بچھڑ کے مجھ سے کبھی وہ بھی سوچتا ہوگا

○

سازِ ناآسودہ پر بجتا ہوا مضراب ہوں
وقت سے پہلے جو ٹوٹا وہ ادھورا خواب ہوں

جسم میں محبوس ہو کر رہ گئی ہے میری روح
قریۂ جاں سے نکلنے کو بہت بے تاب ہوں

میں کوئی پتھر سے تراشوں بت یہ ممکن ہی نہیں
زندگی تیرے لئے اک خواہشِ نایاب ہوں

ناخدا ہے کیوں گریزاں ساتھ چلنے سے مرے
کیا کوئی منزل ہوں میں طوفاں ہوں یا گرداب ہوں

شہرِ دل کو ڈوبنے سے کیا بچائے گا کوئی
وقتِ رخصت چشمِ پرنم میں رکا سیلاب ہوں

○

یہ چشمِ تر مری پتھرا گئی تو کیا ہوگا
یقیں کی آخری حد آگئی تو کیا ہوگا

تلاشِ جذب میں دنیا تیاگ سکتی ہوں
سکوتِ دشت سے گھبرا گئی تو کیا ہوگا

گریز پا ہوں کوئی نقشِ پا ملے نہ ملے
اَنا جو ذات سے ٹکرا گئی تو کیا ہوگا

جنوں کی آخری منزل میں بے خودی میری
لباس روح کو پہنا گئی تو کیا ہوگا

ہوا کے دوش پہ کچھ قصے ان کہے لکھے
یہ داستاں مری دھرا گئی تو کیا ہوگا

فصیلِ جسم سے باہر نکل ذرا شہناز
یہ ڈور سانس کی الجھا گئی تو کیا ہوگا

○

کوئی بھی باندھ کر بندھن کبھی ہم نے نہیں توڑا
نکل کر دشت و صحرا میں مہاروں کو نہیں موڑا

بہت ٹکرائے ہیں اپنی انا کے پتھروں سے ہم
مگر گرتی ہوئی دیوار سے ماتھا نہیں پھوڑا

اچانک خوف سا آنے لگا ہے جب کبھی خود سے
بدل ڈالا ہے چہرہ ہم نے آئینہ نہیں توڑا

شکستہ کشتیوں پر آگے بڑھنا اپنی فطرت ہے
کبھی موجوں کا طوفانوں کا ہم نے دل نہیں توڑا

بلا کی آندھیوں کا سامنا اکثر رہا لیکن
سفینے ہیں بادباں ہم نے ہوا سے رخ نہیں موڑا

چراغِ شام کو تو آخر شب بجھ ہی جانا ہے
چمکتے جگنوؤں سے ربط یوں ہم نے نہیں توڑا

بہت سے دشتِ امکاں منتظر شہناز کے بھی تھے
خود اپنی ذات کی دہلیز کو اس نے نہیں چھوڑا

○

شہرِ دل اپنا لٹا کر تہہِ مژگاں ہونا
تارا بن کر کبھی پلکوں پہ نمایاں ہونا

شبنمی آنکھیں ترے بڑھتے قدم روک نہ لیں
دَمِ رخصت ترا ملنے سے گریزاں ہونا

یاد آجاتا ہے مجھ کو وہ بدلتی رُت میں
اے مری چشمِ تماشا ترا حیراں ہونا

اپنے چہرے پہ کوئی چہرا سجائے رکھنا
جذبۂ شوق میں اچھا نہیں ارزاں ہونا

ان ہواؤں نے بجھا ڈالے سبھی جلتے چراغ
آج دشوار ہے شہناز غزل خواں ہونا

○

راہ کجلائی ہے کچھ تلخیِ ایام کے بعد
کیسے گزرے گا سفر آتشِ ہنگام کے بعد

میرے ہر لفظ میں تحریر میں تو ہی تو ہے
توڑ ڈالوں نہ قلم آج ترے نام کے بعد

کس قدر کرب سمیٹے ہیں بدلتی رت نے
کون سمجھے گا یہ دکھ اتنی حسیں شام کے بعد

ہم تو سورج کے مقابل تھے تہہ آب نہ تھے
آپ ٹھہریں نئے طوفان کے الزام کے بعد

تتلیاں ہوں کہ ترنم ہو کہ خوشبو شہناز
چھوڑ جاتے ہیں نشاں لمحۂ فرحام کے بعد

○

ہزیمتوں کو مری جاں شمار مت کرنا
دلِ شکستہ کو یوں داغدار مت کرنا

کُھلے دریچوں پہ دستک ہوا نہیں دیتی
سماعتوں پہ کبھی اعتبار مت کرنا

چھپا کہ رکھنا دھنک رنگ اپنی آنکھوں میں
خزاں کے رنگ سپردِ بہار مت کرنا

دھواں دھواں ہے فضا راستہ نہیں ملتا
سکوتِ شام مرا انتظار مت کرنا

بس اپنی ذات کا رکھنا بھرم بہرصورت
کسی کو یادِ دلِ بے قرار مت کرنا

○

ہر اک دعا کو مری آج معتبر کر دے
تو رہگذر پہ مری سایۂ شجر کر دے

مسافتوں کی کڑی دھوپ نے جھلس ڈالا
سحاب بھیج رُخِ سائباں ادھر کر دے

میں تھک گئی ہوں قدم میرے اب نہیں اٹھتے
مری طویل مسافت کو مختصر کر دے

زباں کٹتی ہے ہر بات پر خدائے بصیر
سخن شناس ہواؤں کو ہمسفر کردے

وہ شب گزیدہ مسافر بھٹک نہ جائے کہیں
سحر قریب ہے کوئی اسے خبر کردے

○

کیوں آج ترا شوق سفر کم نہیں ہوتا
ہر موسمِ گُل عشق کا موسم نہیں ہوتا

اس ذہن دریچے میں فروزاں ہیں کئی نقش
پر عکس کسی یاد کا مدھم نہیں ہوتا

سناٹا مری روح میں در آتا ہے جس شب
کیوں چاند مرے زخم کا مرہم نہیں ہوتا

تعبیر کے ارمان میں بنتی ہوں نئے خواب
اب خواب بکھرنے پہ کوئی غم نہیں ہوتا

شیرازۂ الفاظ بکھرنے کو ہے شہناز
طوفاں مگر افکار کا مدھم نہیں ہوتا

○

اڑانا تتلیاں خواہش کی میرے بس میں نہیں
حسیں خیال کا پنچھی بھی اب قفس میں نہیں

میں اپنی ذات کے اندھے خلاؤں میں گم ہوں
مرا وجود ابھی میری دسترس میں نہیں

کھڑی ہیں میرے لئے سازشوں کی دیواریں
کوئی بھی زلزلہ کیا آج تیرے بس میں نہیں

تراشوں کیسے میں پیکر بکھر گیا ایزل
کوئی بھی چہرہ تخیل کے کینوس میں نہیں

بگڑ گیا جو توازن تو لٹ گئی بستی
کہ اس کو چھوڑ کے جانا بھی اپنے بس میں نہیں

محبتوں کے سمندر کی پیاس کیا بجھتی
نصیب قُربتِ جاناں تو اس برس میں نہیں

○

نہ کوئی خواہش ہے زندگی کی یہ چشم خونبار کس لئے ہے
اتر رہے ہیں عذاب جاں پر یہ آج پیکار کس لئے ہے

سماعتوں پر ہیں دستکیں سی یہ کون مجھ کو بلا رہا ہے
مرے ہی رستے میں سازشوں کی کھڑی یہ دیوار کس لئے ہے

سفینے جو بچ گئے بھنور سے اتاریں ساحل پہ یا ڈبو دیں
یہ آج طوفاں میں ناخدا میں عجب سی تکرار کس لئے ہے

مٹا دو سارے نشاں خزاں کے نویدِ صبحِ بہار دے دو
سب آبلہ پا گذر چکے ہیں یہ راہ پر خار کس لئے ہے

زمانہ سازوں کے تیز تیشوں سے آئینے دل کے ٹوٹتے ہیں
فضا میں پھیلی ہیں سسکیاں تو ہوا یہ بیزار کس لئے ہے

○

دستکیں بڑھتی گئیں اور فیصلے ہوتے رہے
ہم دریچوں پر گری زنجیر سے لڑتے رہے

خواہشوں کے پھیلنے سے قُربتیں کم ہوگئیں
گھر تو بن پائے نہیں خالی مکاں بنتے رہے

واہموں کے جنگلوں میں گم ہوئی پرچھائیاں
شب کے سناٹے میں ہم سائے سے بھی ڈرتے رہے

دشتِ نامعلوم سے معلوم کی جانب سفر
تھا کٹھن پر ہم خیالِ یار میں بڑھتے رہے

پھول بھی گرتے ہیں زخموں پر تو دیتے ہیں کسک
مژدۂ شامِ بہاراں سے بھی ہم ڈرتے رہے

ٹوٹ کر اپنے ہی اندر مٹ گیا اپنا وجود
کعبۂ دل کی جگہ پھر بتکدے بنتے رہے

اسمِ اعظم سے بھی شہناز اب کے اتنا ہو سکا
دائرے کچھ مٹ گئے کچھ دائرے بنتے رہے

○

آبلہ پا زندگی کو یوں بسر کرتے رہے
خار چُن کر راستوں کو رہ گزر کرتے رہے

کچھ ہجومِ شوق میں ہم کو نظر آیا نہیں
شعلۂ دل کو جلا کر ہم شرر کرتے رہے

اور کچھ طاری رہا آئندہ نسلوں کا بھی خوف
اس لئے ہم کارواں کو در بدر کرتے رہے

رابطہ اپنا زمیں سے ہوسکا کب استوار
اک خلائے بیکراں میں ہم سفر کرتے رہے

ظُلمتِ ہستی کے زنداں میں رہے شہناز قید
ہم سفر کو ہم اجالوں کی خبر کرتے رہے

○

بڑھا ہے حوصلہ اپنا تو مات کھا کر بھی
وہ کیا کرے گا مجھے پھر سے آزما کر بھی

نہ رکھ سکی میں چراغاں کو ذات تک محدود
منایا جشن ہوا میں دیئے جلا کر بھی

مجھے تو یوں بھی کسی اور سمت جانا ہے
کروں گی کیا میں ترے ساتھ آ کر بھی

دکھائی دیتا تھا عکس اپنا جس کی آنکھوں میں
بھلا نہ پاؤں گی اس کو کبھی بھلا کر بھی

نہ توڑ پاؤں گی میں تو سخن کی زنجیریں
دلِ شکستہ ہے ہر آرزو مٹا کر بھی

○

متاعِ زیست لٹا کر کوئی ملال نہ تھا
بجز تمہارے کسی کا مجھے خیال نہ تھا

کبھی نہ حوصلہ پایا کہ دل کی بات کہوں
زمانہ سنتا تھا جو بھی وہ حسبِ حال نہ تھا

عجب طرح سے مسیحائی اس نے کی میری
بڑھانا درد تو زخموں کا اندمال نہ تھا

گلہ کروں بھی تو کس سے کروں گی میں جاکر
جو شخص مجھ کو ملا میرا ہم خیال نہ تھا
بغیر مانگے بہت کچھ ملا تھا مجھ کو مگر
جواب اس کا ملا جو مرا سوال نہ تھا

عذاب جاں پہ مری ہر گھڑی مسلط تھے
میرے نصیب میں خوشیوں کا کوئی سال نہ تھا

سفر کی آخری حد پہ پہنچ گئی شہناز
کہ اب تو گردشِ دوراں کے پاس جال نہ تھا

○

مشکل میں ہوں ایوان تخیل کے سجاکر
اب مجھ کو مری سوچ کے زنداں سے رہا کر

میرے لئے لکھے ہیں اگر رتجگے تو نے
کچھ خواب مری جاگتی آنکھوں کو عطا کر

ہے تجھ کو اگر شوق مرے ساتھ سفر کا
تو بن کے مرا سایہ مرے ساتھ رہا کر

امید کا ہر دیپ ہے طوفان کی زد میں
کیا پاؤں گی میں سوئی تمنائیں جگا کر

میں خوف سے آگے کا سفر کیسے کروں گی
مت چھوڑ اکیلا مجھے یوں خواب دکھا کر

ملتا ہی نہیں مرگِ مسلسل کا کنارا
کہہ دشمنِ جاں سے مرے مرنے کی دعا کر

آواز کو پہچان کر میں آگے بڑھوں گی
تو اپنی صدا کو کبھی بردوشِ ہوا کر

ہر نقش کے پیچھے ہے مرا نقش کفِ پا
کیا تجھ کو ملے گا یوں مرا نام مٹا کر



ادبی سفر

PAK BOOK EMPIRE
70-A1 Al-Sheikh Chamber,
Mozang Road, Lahore